وہی درد میری حیات ہے

قرۃ العین خرم ہاشمی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

قرۃ العین خرم ہاشمی

شمائلہ نے اپنے خیالوں سے باہر آکر' آنے والے کو دیکھا تھا۔ نجانے کب سے گم سم سے بیٹھی وہ سوچوں کے تانے بانے بن رہی تھی جب' راشدہ نے اس کے آنے کی اطلاع دی تھی۔

"اسے یہاں ہی بھیج دو اور تم چائے کی تیاری کرو۔" شمائلہ نے آہستگی سے کہا تھا۔ راشدہ سرہلاتی چلی گئی تھی۔ راشدہ اپنی مالکن کی خاموشی اور پریشانی کو سمجھتی تھی' مگر کچھ بھی کرنے سے قاصر تھی۔

"میں جانتا ہوں کہ میرا بار بار آنا آپ کو ناگوار گزرتا ہے' مگر میں کیا کروں میرا سب کچھ داؤ پہ لگا ہوا ہے! میں ساری کشتیاں جلا کر آیا ہوں' واپس نہیں پلٹ سکتا۔ اب صرف فیصلہ ہی ہوگا آر یا پار....! درمیانی کوئی راہ نہیں بچی اب....!" آنے والے کے چہرے پہ رت جگوں کی چھاپ تھی۔ آنکھوں میں سرخی اور تھکن کے اثرات واضح تھے۔ شمائلہ نے آنے والے کا سر سے لے کر پاؤں تک جائزہ لیا۔ شکل و صورت میں اچھا تھا۔ مناسب جسم اور تقریباً" پانچ فٹ چار انچ کے قریب اس کا قد تھا اور اس کی شخصیت میں یہ ہی کمی تھی۔ باقی تعلیم' شخصیت یا بول چال میں وہ کسی طرح کم نہیں تھا اور یہ "کمی" بھی شمائلہ کو اس لیے محسوس ہوئی تھی کیوں کہ ان کے خاندان میں ہائٹس وغیرہ بہت آئیڈیل ہوتی تھیں۔ خود شمائلہ کی پانچ فٹ آٹھ انچ تھی۔

"اگر آپ اجازت دیں تو....!" شمائلہ کی پوسٹ مارٹم کرتیں نظروں سے خائف ہوتے ہوئے' اس نے ہاتھ میں پکڑی کار کی چابی گھماتے ہوئے پوچھا تھا۔

"وہ یہاں نہیں آئے گی۔ میں جانتی ہوں اس کی ضد کو' مگر تم اس سے مل سکتے ہو۔ مگر....!" شمائلہ نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

"مگر کیا؟" اسے اجازت ملنے کی جتنی خوشی ہوئی تھی' مگر سن کر ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔

"ہم شریف اور عزت دار لوگ ہیں ہمارے یہاں اجنبیوں کو صرف ڈرائنگ روم تک ہی محدود رکھا جاتا ہے۔ اگر آج تمہیں گھر کے اندر آنے کی اجازت مل رہی ہے تو صرف اس لیے کہ...." شمائلہ یہاں آکر سانس لینے کے لیے رکی تھی۔

"اس لیے کہ آپ مجھے اجنبی نہیں سمجھتی ہیں۔" سامنے والے نے پورے یقین سے کہا تھا تو شمائلہ اس کے اعتماد پہ خفیف سا مسکرائی تھی' مگر فوراً" ہی اسی سنجیدگی سے بولی تھی۔

"تمہاری حد سے بڑھی خود اعتمادی نے ہی آج ہمیں یہ وقت دکھایا ہے کہ ہماری عزت اور شرافت ہی آج سب کی نظروں میں مشکوک بن کر رہ گئی ہے۔"

"میں اس سب کے لیے شرمندہ ہوں۔" اس نے اپنی غلطی کو تسلیم کیا تھا۔

"تمہیں ہونا بھی چاہیے اس لیے کہ ایک طرح سے اس سب کے ذمہ دار بھی تم ہی ہو۔" شمائلہ نے سخت لہجے میں کہا تھا۔ سامنے والا ہونٹ بھینچ کر رہ گیا تھا جو بھی تھا یہ ذلت اس نے خود مول لی تھی۔

"تم اس سے بات کر کے دیکھ لو۔ اگر وہ تمہاری بات سمجھ گئی تو ٹھیک ہے۔ دوسری صورت میں اس گھر کے دروازے اپنے لیے بند سمجھنا۔" شمائلہ نے

آوازدے کر راشدہ کو بلایا تھا۔
"انہیں چھوٹی بی بی کے پاس لے جاؤ۔" راشدہ نے اثبات میں سر ہلا کر اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا تھا۔ اس کا رخ پیچھے والے صحن کی طرف تھا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد شمائلہ بے دلی سے ریموٹ ہاتھ میں پکڑے چینل سرچنگ میں مصروف ہو گئی تھی۔ اس کے خوب صورت چہرے پہ اضطراب بہت واضح تھا۔ جو پچھلے کتنے ہی عرصے سے اس کے دل کے

آنگن میں ٹھہر چکا تھا۔ دباؤ اتنا بڑھ چکا تھا کہ وہ بھی اب فوراً "فیصلہ چاہتی تھی" چاہے کچھ بھی ہوتا۔ اس کے بعد ہی آگے کا لائحہ عمل سوچا جا سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج بھی وہ اپنے مخصوص حلیے میں تھی۔ بے ترتیبی سے سمیٹے گئے بال جو پشت پہ بکھرے ہوئے تھے۔ ملگجا سے سوٹ جس پہ لگتا ہے کہ کبھی استری کی

ہی نہیں ہو۔ اس کے سانولے سے چہرے پہ دکھ کی پرچھائیں اور آنکھوں سے چھلکتی ویرانی بہت واضح تھی۔ آسٹریلین طوطوں کے پنجرے کے پاس رکھی کرسی پہ وہ گم صم سی بیٹھی تھی' جب راشدہ اسے وہاں چھوڑ کر گئی اور اس کی موجودگی محسوس کرتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات یک دم پتھریلے ہوگئے تھے۔ وہ بہت خاموشی سے اس کا جائزہ لیتا آگے بڑھا تھا اور اس کے پاس آکر پنجوں کے بل بیٹھا تھا اور اس کے چہرے کو اپنی نظروں کی گرفت میں لیتا ہوا بولا تھا۔

"چلو اک خواب لکھتے ہیں

دکھوں کی رات لمبی ہے

کوئی مہتاب لکھتے ہیں...!"

"میرا پیچھا چھوڑ دو۔"

اس نے سرد آواز میں کہا تھا

"ایک تمہیں ہی تو نہیں چھوڑ سکا آج تک" اس نے بے بسی سے اعتراف کیا تھا' مگر وہ بہت سرد نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ آج اس نے منہ نہیں پھیرا تھا۔ ورنہ آج سے پہلے وہ اسے دیکھ کر منہ پھیر لیتی تھی۔ آج اس کے انداز میں کچھ الگ تھا جسے وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا' مگر اس کے لیے اتنا ہی بہت تھا کہ محبوب نے نظر کرم کی ہے۔

"میں ایسا کیا کروں کہ تم مان جاؤ؟" اس نے بے بسی سے پوچھا تھا۔

"اب بھی تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت باقی رہ گئی ہے؟" اس کی سرد آواز میں شعلوں کی لپک تھی' مگر سامنے والا آج ہر حال میں جیتنے ہی آیا تھا۔

"تم جانتی ہو کبھی غور کیا ہے کہ بچے ضد کرکے رو کر بات کیوں منوا لیتے ہیں؟ وہ بحث' دلائل' منطق سے کام نہیں لیتے ہیں وہ ایسا ہتھیار استعمال کرتے ہیں جو کند نہیں ہوتا آج میرا بھی یہ ہی دل کر رہا ہے کہ میں بھی اسی طرح ضد کروں اسی طرح زور زور سے رو دوں' جانتی ہو کیوں؟" اس نے' خاموش بیٹھی لڑکی کی سوالیہ نگاہوں میں جھانکا تھا۔

"تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ انسان کسی نہ کسی ایک کے لیے ہی بچہ ہوتا ہے! یا بچہ بن جاتا ہے۔ اتنا بے بس اور بس بے بس کہ اس کی ساری منطقیں اس کی ساری عقل' طاق پہ دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ پتا نہیں کیوں' مگر تم سے اسی طرح ضد کرنے کو دل چاہتا ہے۔ زندگی میں کبھی خود کو اتنا بے بس و مجبور نہیں پایا اب بھی فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے تم بار بار انکار کروگی میں بار بار آؤں گا۔ اگر تم اپنی ضد نہیں چھوڑ سکتیں تو...!

میری تو "محبت" کا معاملہ ہے۔ میں کیسے اپنی محبت چھوڑ دوں۔" اس کے آخری جملوں میں وہ چونکی تھی۔ زیر لب دہرایا تھا۔ "محبت"

"کیا محبت کو پالینا ہی سب کچھ ہے؟ اگر محبت پالینے کے بعد یہ نظریہ بدل گیا تو؟" اس نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا تھا جیسے کسی نتیجے پہ پہنچنا چاہ رہی ہو۔

"آزما کر دیکھ لو...!" اس نے دعوا کیا تھا۔

"میں کسی "تجربے" کے لیے نہیں ہوں کہ آپ کے دعوؤں پہ خود کو پرکھوں۔" اس کے چہرے پہ ناگواری پھیل چکی تھی۔

"میں کھلے دل سے آواز دے رہا ہوں کسی تجربے کے لیے نہیں! میرے دروازے کھلے ہیں تمہارے لیے جب جی چاہے آجاؤ! کیوں کہ اگر آزمائش ہی فیصلے کا ترازو ٹھہرا تو پھر پوری طرح ناپ تول کرلیں۔ کل کس نے دیکھا ہے؟ کون جانے کہ کیا ہو؟ اس لیے کوئی دعوا نہیں کروں گا' مگر میں اپنے حال' اپنے دل سے اچھی طرح واقف ہوں اور کہاں ہوں؟ اور کیا کرسکتا ہوں! بس وہی جانتا ہوں۔

اتنے سالوں سے اس یکطرفہ محبت کو لیے جی رہا ہوں اب اگر قسمت نے مجھے یہ موقع دیا ہے تو اسے کیسے گنوادوں؟ تم جو چاہو میں ضمانت دینے کو تیار ہوں' مگر پلیز اب یہ ضد چھوڑ دو۔ مان لو کہ قسمت نے تمہیں مجھ سے ایسے ہی ملوانا تھا۔ اب کیا مر جاؤں گا تو یقین کروں گی میرا؟" اس نے بے بسی کی انتہا پہ کھڑے کہا تھا۔

بادلوں کی گھن گرج اور آنکھ مچولی جاری تھی۔ کسی

بھی لمحے بارش شروع ہو سکتی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نے اپنا لمس بخشا تو اس کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ رینگ گئی۔ ایسے جیسی کافی عرصے کی سوچ و بچار کے بعد وہ کسی فیصلے پہ پہنچ گئی تھی اس مسکراہٹ نے' آنے والے کو امید کا جگنو تھمایا تھا وہ بولی تو چہرے پہ پھیلی مسکراہٹ کے برعکس لہجہ سرد ہی تھا۔

"میں نے یقین کیا۔" یہ لفظ سنتے ہی سائل کو ایسا لگا جیسے کسی نے اپنے خزانے کے منہ کھول دیے ہوں۔ ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔

"میں نے یقین کیا اس شخص کا! جس نے مجھے جیتے جی بے یقینی کے اندھیروں میں لا کھڑا کیا ہے۔" اس کے منہ سے نکلے اگلے لفظوں نے اس کے چہرے کا رنگ اڑا دیا تھا' مگر فوراً" ہی اس نے خود کو سنبھالا اور اقرار کے لفظوں کو دہراتا واپسی کے لیے مڑ گیا۔ اس کے جاتے ہی لڑکی نے آنکھیں بند کرلیں اور چہرہ آسمان کی طرف کرلیا۔ اس کے چہرے کو بارش بھگو رہی تھی۔ جانے والے نے پلٹ کر' بارش میں بھیگتی' سانولی' سلونی سی لڑکی کو دیکھا تھا۔ دنیا کے لیے یہ بارش رحمت تھی اور اس کے لیے وہ بارش جیسی لڑکی رحمت تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے تیز تیز قدموں سے پلٹ گیا۔

لاؤنج میں بے زار بیٹھی شمائلہ' اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر چونک گئی تھی۔ ایک بوجھ سا سر سے سرکا تھا۔ شمائلہ نے اطمینان سے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔ جو پورے یقین سے اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ وہ فاتح تھا۔ اس لیے اب اس کی بات سننی اور ماننی ضروری ہو گیا تھا اور یہ ضروری کام شمائلہ نے فوراً" کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کنول کی بچی! شادی کروا کے کیسے گم ہو گئی ہو جیسے تمہارے آگے پیچھے تو کوئی رہا ہی نہیں ہے۔ بے وفا لڑکی چلو پیچھے ہٹو یہ جھوٹی محبت مت جتلاؤ۔" ہما نے گلے لگی کنول کی کمر پہ ہلکا سا مکا مارا تھا اور اسے خود سے الگ کرتے ہوئے مصنوعی خفگی سے بولی تھی۔ کنول ہنستے ہوئے الگ ہوئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسی شاپنگ پلازہ کے فوڈ کورٹ میں لے آئی۔

"آرام سے بیٹھو یہاں پھر شکوے کرلینا۔ مجھے تو بہت بھوک لگی ہے تم کچھ لوگی؟" کنول نے کاؤنٹر کی طرف جاتے ہوئے شرارتاً" رک کر پوچھا تھا۔

"ہاں! تمہارا سر۔۔۔!" ہما نے دانت پیستے ہوئے کہا تو کنول ہنستے ہوئے مڑ گئی جبکہ ہما کے چہرے پہ بھی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ آج ایک سال بعد کنول کو اچانک شاپنگ مال میں دیکھ کر ہما خوشی و حیرت سے چلا اٹھی تھی۔ دونوں کالج کے زمانے کی قریبی دوستیں تھیں کنول کی شادی ماسٹرز کرتے ہی ہو گئی تھی اور وہ شادی کے بعد فیصل آباد چلی گئی تھی۔ جبکہ ہما ایک اسکول میں جاب کر رہی تھی۔ اس کی منگنی بھی ہو چکی تھی اور عنقریب شادی متوقع تھی۔

"ہاں اب بولو کیا کہہ رہی تھیں تم۔ میری جدائی میں بھی تم سدھری نہیں ہو۔ ویسے کی ویسے ہی لڑاکا ہو۔" کنول نے مسکراتے ہوئے ہما کو دیکھا تھا جو نفش پر گر سے مکمل انصاف کرتی ہوئی اسے گھور کر رہ گئی تھی۔

"جی اور محترمہ تو ماشاء اللہ دن بہ دن نکھرتی ہی گئی ہیں۔ شادی کے بعد بات بات پہ ہنسی اور آنکھوں کی چمک لگتا ہے محسن بھائی کی محبت کا جادو پوری طرح چل چکا ہے۔" ہما نے اس کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا تو محسن کے نام پہ شرمگیں سی ہنسی اس کے لبوں پہ پھیل گئی۔ "بکو مت اور یہ بتاؤ تمہارے ہاتھ کب پیلے ہو رہے ہیں۔" کنول نے موضوع پلٹ دیا تھا۔ ہما جانتی تھی کہ وہ فطرتاً" کافی شرمیلی ہے۔

"ان شاء اللہ بہت جلد' مگر تم نے کون سا آجانا ہے شادی پہ۔ آج بھی اتفاقاً" مل گئی ہو۔ تم سے اس بے وفائی کی امید نہیں تھی۔" ہما نے خفگی سے کہا تو کنول نے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"میں جانتی ہوں کہ مجھ سے غلطی ہو گئی' مگر کیا کروں شادی کے بعد مصروفیت ایک دم سے ہی اتنی

بڑھی کہ چاہتے ہوئے بھی تم سے رابطہ نہیں کر سکی۔ حمزہ بھائی اور آپی بھی شارجہ شفٹ ہو گئے۔ اس لیے لاہور آنا بھی بہت کم ہو گیا ہے آج کل وہ لوگ چھٹیوں میں آئے ہوئے ہیں۔ اسی لیے میں بہت مشکل سے محسن سے اجازت لے کر تین دن کے لیے رہنے آئی ہوں اور۔۔۔" اس سے پہلے کہ وہ بات مکمل کرتی۔ ہما نے اسے ٹوکتے ہوئے پوچھا تھا۔

"مشکل سے کیوں؟ محسن بھائی نے تمہیں کیا قید کر کے رکھا ہوا ہے۔"

"بس ایسا ہی سمجھ لو دراصل محسن کو کہیں آنا جانا یا ملنا جلنا پسند نہیں ہے۔ پھر ان کے آفس جانے کا مسئلہ وقت پہ کھانے وغیرہ کی تنگی ہو جاتی ہے اس لیے میں بھی کم ہی کہیں آتی جاتی ہوں۔"

کنول نے فوراً" شوہر کی طرف داری کی تھی۔

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم میری شادی پہ بھی نہیں آؤ گی؟" ہما نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا تھا۔

"نہیں میں ضرور آؤں گی۔ تم بس شادی کرو' باقی فکریں چھوڑو۔" کنول نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تھا پھر دونوں ایک گھنٹے کے بعد وہاں سے اٹھی تھیں' مگر دل ابھی بھی باتوں سے نہیں بھرا تھا۔ فون نمبرز کے تبادلے ہو چکے تھے۔ دونوں شاپنگ بیگز ہاتھ میں پکڑے پارکنگ ایریا میں آئیں تو ہما ایک دم سے بولی۔

"اب دیکھنا! شیری نے کتنی سنانی ہے مجھے انتظار کروانے پہ۔" اپنی کار کے پاس آتے ہوئے ہما نے شرارت سے کہا تھا۔ کنول دھیرے سے ہنس پڑی جب شیری کی نظر اس پر پڑی وہ جو غصے میں کھولتا' ہما کی طرف آ رہا تھا ایک دم ہی ٹھنڈا ہو گیا تھا اور بہت خاموشی سے ان دونوں کو دیکھنے لگا تھا۔ کنول نے پاس آ کر سلام کیا۔ جس کا جواب بہت سنجیدگی سے دیا گیا تھا۔

"تمہیں ایک بات بتانی تو بھول ہی گئی تھی میں' شیری بھی آج کل فیصل آباد میں ہوتا ہے اپنی جاب کی وجہ سے۔۔۔" ہما کے کہنے پہ کنول نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ شیری' ہما سے ایک سال بڑا تھا' مگر دونوں میں دوستی بہت تھی۔

"آؤ ہم تمہیں ڈراپ کر دیتے ہیں۔" ہما نے آفر کی تھی۔

"نہیں حمزہ بھائی کا ڈرائیور ہے میرے ساتھ دراصل آج ایمان کی سالگرہ ہے۔ اسی کی سرپرائز تیاری میں سب لگے ہوئے ہیں۔" کنول نے مسکراتے ہوئے بتایا تھا۔ اور انہیں خدا حافظ کہتے ہوئے اپنی کار کی طرف مڑ گئی تھی۔ ایمان سات سال کی بہت پیاری بچی تھی۔ کنول کی اس میں اور اس کی کنول میں جان تھی۔

"آج تمہاری یہ گمشدہ دوست کہاں سے مل گئی؟" کار چلاتے ہوئے شیری نے سرسری سے لہجے میں پوچھا تھا۔ ہما جو اس کے غصے نہ کرنے پہ خوش تھی۔ تفصیل سے اپنی اور کنول کی ملاقات کے بارے میں بتانے لگی تھی وہ کتنی خوش تھی اس کے لہجے سے پتا چل رہا تھا' مگر وہ ضبط کی کسی منزل سے گزر رہا تھا صرف وہ ہی جانتا تھا یا اس کا دل! جو آج بھی اسی کے احساس سے دھڑکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہاں کیوں کھڑی ہو دعا؟" شمائلہ نے بھیگتی رات کی پھیلی تنہائی اور تاریکی میں اسے گم صم سا پورچ کی سیڑھیوں پہ بیٹھے ہوئے دیکھا تو پاس آ کر دھیرے سے بولی تھی۔ دعا نے ایک خاموش نظر اس کے چہرے پہ ڈالی تھی اور دوبارہ سے سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ شمائلہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔ پچھلے کئی مہینوں سے وقت کی سختی اور آزمائش کی زد میں ان دونوں کا رشتہ بھی آ گیا تھا۔ جس میں زیادہ ہاتھ شمائلہ کا تھا جو اس آزمائش اور مشکل وقت میں اس کا ساتھ نہیں دے پائی تھی' مگر وہ بھی اپنے حالات سے مجبور تھی۔ امریکا میں اس کا شوہر اور دونوں بچے اس کے واپس آنے کے منتظر تھے۔ جبکہ سب سے چھوٹا تین سال کا بیٹا اذان اس کے ساتھ تھا۔ دعا کا مسئلہ حل ہوتا تو وہ سکون سے واپس اپنے گھر جا سکتی۔

"دیکھو دعا!" شمائلہ نے گہری سانس لے کر بولنا شروع کیا۔ اس کا لہجہ متوازن اور سنجیدہ تھا۔

"جو کچھ بھی ہوا اس میں تمہارا قصور تھا یا نہیں یہ اب الگ بات ہے۔ جو نقصان ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ اس پہ سوائے افسوس کرنے کے ہم کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔" شمائلہ نے دیکھا کہ دعا کے گود میں رکھے ہاتھوں پہ پانی کے قطرے گر رہے تھے اس کا مطلب کہ وہ رو رہی تھی پچھلے کئی مہینوں سے وہ یہ کام تو مسلسل کر رہی تھی کہ شمائلہ اب چڑنے لگی تھی۔

"ہر وقت کا رونا۔" شمائلہ کو یہ نحوست لگتی تھی۔

"بہت اچھا ہوا ہے کہ تم نے عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے اسے خالی ہاتھ نہیں لوٹایا ہے آج کل تو کنواری لڑکیوں کو رشتے ملنا بہت مشکل ہے۔ تم تو طلاق یافتہ اور وہ بھی ایک الزام کے ساتھ.....! خیر چھوڑو۔ میں اسے کل ڈنر پہ بلا رہی ہوں تاکہ باقی کے معاملات طے کر لیے جائیں۔ سادگی سے تمہارا نکاح کر کے تمہیں رخصت کر دوں گی۔ اس سے اگلے دن میری امریکا واپسی۔ اوپر والا پورشن پہلے ہی کرائے پہ ہے کافی سالوں سے وہ لوگ اچھی دیکھ بھال کر لیتے ہیں گھر کی۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں جہاں آنسوؤں کی قدر نہ ہو وہاں رونا بھی نہیں چاہیے۔ اب نہیں روؤں گی۔ آپ کے سامنے تو کبھی بھی نہیں۔ میں نے زندگی میں ایک بات تو ضرور سیکھی ہے کہ صرف رونے دھونے ' ماتم کرنے سے کچھ نہیں ہوتا ہے۔ دنیا کے پاس وہ نظر' وہ احساس ہے ہی نہیں جو ان سب کے پیچھے چھپی آپ کی تکلیف کو دیکھ یا محسوس کر سکے پھر ایسی توقع رکھنا فضول ہی ہوا نا یہاں سب وہی سمجھتے ہیں جو وہ سمجھنا چاہتے ہیں۔ پھر کیا فائدہ خود کو ضائع کرنے کا۔" دعا نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے خاموش بیٹھی شمائلہ کی طرف دیکھا تھا۔

"آپ نے اب تک جو بھی کیا۔ میں اس کے لیے احسان مند ہوں' مگر زندگی میں دوبارہ کبھی آپ کو ایسی زحمت نہیں دوں گی۔ احساس کا' مان کا اور تعلق کا ہر رشتہ یہاں ہی مدفن کرتے ہیں۔ آج سے آپ بھی آزاد اور میں بھی.....!" دعا نے شمائلہ کے چہرے کے پھیکے پڑتے رنگوں کو دیکھا اور مڑ کر اندر چلی گئی تھی جبکہ شمائلہ اسی جگہ گم صم سی بیٹھی بھیگی رات کے ساتھ ساتھ سفر کر رہی تھی۔

ضروری تو نہیں ہوتا کہ تنہائی' اذیت اور خاموشی کا یہ سفر ہمیشہ دوسرے ہی کریں' کبھی کبھی یہ راتیں وہاں بھی ٹھہر جاتی ہیں جہاں روشن دن اور سویرے چمکتے ہوں۔ راتیں تو بس ذرا سا ساتھ چاہتی ہیں جیسے ہی وہ ساتھ ملتا ہے وہ فوراً" ڈیرا ڈال لیتی ہیں اب دعا کے لفظوں نے سچ کا جو آئینہ دکھایا تھا۔ شمائلہ لاکھ انکار کرتی' مگر اس کے دل کے کسی گوشے میں یہ رات اور اس کی اذیت ہمیشہ کے لیے ڈیرا ڈال چکی تھی۔ اپنی ذات کے تاریک حصے دیکھنا کب آسان ہوتا ہے؟ ضمیر کی چبھن اسی کا نام تو ہے۔

☼ ☼ ☼

"محسن پلیز جانے کی اجازت دے دیں میری بہت اچھی اور قریبی دوست ہے ہما۔" کنول نے چائے کا کپ ٹی وی دیکھتے محسن کو تھمایا تھا اور وہ مطالبہ دہرایا جو وہ پچھلے کچھ دنوں سے کر رہی تھی۔ ہما کا فون آیا تھا کہ شادی کی تاریخ وغیرہ طے ہو گئی ہے شیری کے ذریعے اسے آج کل میں کارڈ ملنے والا تھا۔ کنول نے یہ سنتے ہی محسن کو منانا شروع کر دیا تھا کیوں کہ محسن کو ایسی تقریبات میں جانا قطعی ناپسند تھا۔

"چھوڑو یار فضول کی تقریبات کو! اس سے بہتر ہے کہ ہم دونوں کہیں آؤٹنگ پہ چلیں گے۔ تمہیں اچھی جگہ سے ڈنر کرواؤں گا اور شاپنگ بھی!" محسن نے کنول کو بہلاتے ہوئے کہا تھا۔

"مجھے نہیں کرنی کوئی بھی آؤٹنگ وغیرہ! میں نے ہما سے وعدہ کیا ہے اس کی شادی میں شرکت کا۔" کنول نے منہ پھلاتے ہوئے کہا تو چائے پیتا محسن چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"مجھ سے پوچھے بغیر میری مرضی جانے بغیر تم اس

طرح کوئی بھی وعدہ کیسے کر سکتی ہو؟" محسن نے سنجیدگی سے پوچھا تو کنول گھبرا گئی جانتی تھی کہ محسن کا دماغ کسی بھی چھوٹی سے چھوٹی بات پہ الٹ سکتا ہے اور وہ کچھ بھی سوچ یا سمجھ سکتا ہے۔

"نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا میں تو صرف....." کنول نے گھبرا کر وضاحت دینا چاہی، مگر تب تک دیر ہو چکی تھی۔ محسن کے ماتھے پہ تیوریاں بہت واضح تھیں۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ مجھے اپنی مرضی کرنے اور شوہر کو نظر انداز کرنے والی عورتیں بالکل پسند نہیں ہے' اگر تم اپنی مرضی کرنا چاہتی ہو تو شوق سے کرو' مگر پھر مجھ سے کوئی امید مت رکھنا۔" محسن نے غصے سے چائے کا کپ میز پہ رکھا اور تن فن کرتا اندر کمرے میں چلا گیا۔

"اف توبہ! جب مجھے پتا ہے محسن کے مزاج کا تو آرام سے اور تحمل سے اسے مناتی۔ ضد کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ خود ہی اپنے پاؤں پہ کلہاڑی مار لی ہے میں نے۔" کنول نے خود کو کوسا اور گہری سانس لیتی اندر کمرے کی طرف چل پڑی کہ ابھی محسن کا منانا بھی بہت مشکل مرحلہ تھا۔ محسن غصے کا تیز ضرور تھا' مگر کنول سے محبت بھی کرتا تھا اس لیے زیادہ دیر تک اس سے ناراض نہیں رہ پاتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ اس طرح جذباتی طور پر مجھے بلیک میل کر لیں گی تو آپ غلط ہیں۔ میں اپنے فیصلے سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ یہ اچھی طرح سمجھ لیں آپ سب اور یہ رونے دھونے کا سین ختم کریں۔" اس نے پچھلے کئی دنوں کی مسلسل ذہنی اذیت اور رت جگے کی جھنجلاہٹ ماں بہنوں پہ نکالی تھی۔ تینوں بہنیں ہکا بکا اس کی شکل دیکھ رہی تھیں۔ وہ کبھی اتنا بدلحاظ نہیں رہا تھا بلکہ بڑے دو بھائیوں کی نسبت وہ اپنی تینوں بہنوں سے بہت قریب تھا۔

"امی دیکھ رہی ہیں آپ اس کے تیور۔ ایک غیر لڑکی کے لیے اپنوں کو چھوڑ رہا ہے۔" بینا باجی نے روہانسے لہجے میں کہا تو وہ جھنجلا کر بولا۔

"اف توبہ ہے میں نے بھلا کب کسی کو چھوڑنے کی بات کی ہے یہ سب تو آپ خود کر رہی ہیں بلاوجہ کی ضد کر کے۔"

"بلاوجہ کی ضد! یہ جانتے ہوئے بھی کہ پچھلے دو سالوں سے عظمیٰ سے تمہاری بات طے ہے' میں کیا منہ دکھاؤں گی اپنی بہن' اور تم نے کوئی حور پری ڈھونڈی ہوتی تب بھی کوئی بات تھی۔ ایک عام سی لڑکی اور اوپر سے طلاق یافتہ بھلا بتاؤ میرے بیٹے کے لیے وہ چڑیل ہی بچی تھی۔" ماں کی بات سن کر ناگواری کی شدید لہر اس میں اٹھی تھی۔ راحت بیگم نے بیٹے کے چہرے کے تاثرات سے جان لیا تھا کہ وہ ضبط کی کڑی منزل سے گزر رہا ہے۔

"دیکھیں امی! آپ نے اپنے سب بچوں کی شادی اپنی پسند سے کی ہے۔ اگر ایک کی نہیں بھی کریں گی تو کیا فرق پڑے گا؟ میں آپ کا دل نہیں دکھانا چاہتا' مگر یہ میرا اٹل فیصلہ ہے! میں ابو سے بھی بات کر چکا ہوں اگر انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے تو آپ کو بھی نہیں ہونا چاہیے۔" اس نے آخری بار ماں کو سمجھانا چاہا۔

"ہاں اس بے چارے کو اعتراض ہونا بھی کیسے ہے؟ جب جوان اولاد منہ زور ہو جائے۔ ویسے بھی یہ گھر اور اس کا سب انتظام تم لوگوں کے رحم و کرم پر ہے' باپ تو کئی سالوں سے بیمار ہو کر بستر سے لگا اپنا وقت گزار رہا ہے۔ اسی لیے تو تم لوگ اتنے منہ زور ہو گئے ہو۔" راحت بیگم نے غصے سے کہا تھا۔ عثمان علی کو مختلف جسمانی عارضے لاحق تھے۔ اس لیے کئی سالوں سے فراغت کے روز و شب میں وقت گزار رہے تھے ویسے بھی سب اولادیں اپنی اپنی لائف میں سیٹ تھیں۔ تینوں بیٹوں نے گھر کا انتظام بہت اچھی طرح سے سنبھالا ہوا تھا۔ اس لیے کسی طرح کی تنگی یا مشکل نہیں تھی اس گھر میں۔

"آپ سب میرے ساتھ ان کے گھر جائیں گی یا نہیں؟" اس نے حتمی لہجے میں پوچھا تھا۔

"نہیں! کبھی بھی نہیں چاہے کچھ بھی ہوجائے۔" راحت بیگم نے بھی ہٹ دھرمی سے کہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک خاموش نظروں سے ان سب کے چہرے دیکھتا رہا۔ پھر گہری سانس لے کر بولا تھا۔

"میں رشتے توڑنے کا قائل نہیں ہوں امی! نہ ہی ایسا کچھ چاہتا ہوں، مگر آپ لوگوں کی انا اور ضد ہر بات کو خراب کر رہی ہے، میں اگر ایک نئے رشتے کے لیے آپ سب سے لڑ سکتا ہوں تو آپ سب کے لیے بھی وہ سب کر سکتا ہوں جو میرا فرض ہے اور آپ لوگوں کا حق۔ بہر حال میں اس جمعہ کو نکاح کر رہا ہوں اگر آپ سب شامل ہونا چاہتے تو میری خوشی مکمل ہو جائے گی۔" اس نے مضبوط لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا تھا۔

"وہ کبھی اس گھر میں قدم نہیں رکھے گی یہ یاد رکھنا اگر تمہیں ہماری پروا نہیں تو ہمیں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔" راحت بیگم نے تنفر سے کہتے ہوئے منہ پھیر لیا تھا۔ اس نے ہونٹ بھینچ کر پہلے ماں اور پھر تینوں بہنوں کے چہرے کی طرف دیکھا تھا جہاں انکار بہت واضح لکھا تھا۔ وہ غصے سے دروازہ بند کرتا کمرے سے نکل گیا تھا۔ پیچھے باتیں تھیں، شکوے تھے اور بددعائیں تھیں۔ جنہوں نے بڑی دور تک اس کا پیچھا کیا تھا مگر ارادوں اور زبان کے پکے ہر مشکل سے نمٹنا جانتے تھے۔ نامناسب حالات اور آزمائش ہونے کے باوجود اس نے اپنا کیا نبھایا تھا اور جمعہ کے دن اپنے چند قریبی دوستوں کی موجودگی میں دعا کو اپنا نصیب ہمیشہ کے لیے بنا لیا تھا۔ یہ اس کی وہ محبت اور جنون تھا جس کو پانے کی تمنا میں وہ ایک عرصے سے بے تاب تھا۔ اسے محبت کا ملن نصیب ہوا تھا۔ اس کی خواہش پہ کن لکھا جا چکا تھا۔ انسان اپنی سوچ اور سمجھ کے مطابق اپنی زمینی جنت کی بنیاد رکھتا ہے۔

اگر دیکھا جائے تو ہر فیری ٹیل کی طرح جب شہزادی کو شہزادہ مل جاتا ہے تو ہیپی اینڈنگ ہو جاتی ہے، مگر زندگی فیری ٹیل سے زیادہ دلچسپ اور حیران کن ہے زمین پہ دو ستاروں کا ملن جب ہوا تو کیا وہ ایک دوسرے سے ٹکرا کر فضا میں دور دور تک بکھر گئے یا ان ستاروں نے مل کر ایک نئی کہکشاں بنالی ہے۔ اس کا فیصلہ آنے والا وقت کرتا ہے۔

☼ ☼ ☼

محسن نے کال بیل کی آواز پہ ریموٹ صوفے پہ پھینکا اور اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی آفس سے واپس آیا تھا۔ کنول اس کے لیے چائے بنا رہی تھی۔ کچن میں مصروف اس نے بھی بیل کی آواز سنی تھی۔ چائے دم پہ رکھ کر کنول نے کچن سے نکل کر ایک نظر یونہی دروازے پہ ڈالی جہاں محسن کسی سے پوچھ رہا تھا۔

"جی آپ کون اور کس سے ملنا ہے؟" محسن نے اپنے سامنے کھڑے اسمارٹ سے لڑکے کو دیکھا تھا جو متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اپنے سامنے کھڑے شخص کے چہرے پہ پھیلے ناگوار تاثرات وہ بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ اسی وقت کنول کی نظر اس پہ پڑی۔

"ارے شیری آپ!" کنول نے آگے بڑھ کر کہا تو محسن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ شیری نے اسے دیکھ کر سکون کی سانس لی تھی۔

"محسن میں نے آپ کو اپنی بیسٹ فرینڈ ہما کے بارے میں بتایا تھا یہ ان کے بھائی ہیں اور ہما کی شادی کا کارڈ دینے آئے ہیں۔ صبح ہما نے فون کر کے ایڈریس لیا تھا۔" کنول نے مسکراتے ہوئے وضاحت کی تو محسن کے چہرے کے تاثرات نرم پڑے۔

"آئیے آپ اندر تشریف لائیے۔" محسن نے حق میزبانی نبھایا تھا۔

"نہیں میں بس یہ کارڈ دینے آیا تھا۔" شیری نے کارڈ آگے بڑھایا۔

"اچھا نہیں لگتا آپ چائے پیے بغیر تو نہیں جا سکتے آیئے پلیز۔" کنول نے آہستگی سے کہا تو محسن نے بھی تائید میں سر ہلایا۔ شیری نے چھوٹے سے، مگر نفاست سے سجے گھر میں قدم رکھا تھا اور بہت گہری نظروں سے ہر چیز کا جائزہ لیا تھا۔ محسن کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کرتے، وہ بہت اچھی طرح سے

اس کے مزاج کو سمجھ چکا تھا۔ محسن بہت سنجیدہ اور لیے دیئے انداز کا مالک تھا۔ کچھ دیر میں کنول چائے کی ٹرالی سجائے اندر داخل ہوئی۔ چائے پی کر شیری نے اجازت چاہی اور شادی پہ آنے پہ اصرار کیا جسے محسن نے سر ہلا کر ان شاء اللہ کہا۔ وہ دونوں اسے دروازے تک چھوڑنے آئے جب محسن کے موبائل پہ کال آئی اور وہ فون سنتا اندر کی طرف چل پڑا۔

"ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے کبھی ایک دوسرے کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ آپ میرا موبائل نمبر رکھ لیں۔" شیری نے کچھ سوچ کر جیب سے ایک کارڈ نکال کر کنول کی طرف بڑھایا تھا۔ جسے کنول نے بخوشی تھام لیا۔

"آپ کا نمبر میرے پاس ہے ہمانے ایڈریس کے ساتھ ہی دیا تھا کہ اگر کوئی مشکل ہو تو آپ کے نمبر پہ کال کر کے پوچھ لوں۔" شیری نے مسکرا کر کہا تھا اور خدا حافظ کہتا ہوا گھر کی دہلیز پار کر گیا تھا۔ کنول بہت خوشی سے گنگناتے ہوئے چائے کے برتن سمیٹنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"محسن آج عافیہ آپی نے شاپنگ پہ جانے کا پروگرام بنایا ہے۔ میں کھانا بنا جاؤں گی۔ آپ پلیز گرم کر کے کھا لیجیے گا۔ ہمارے انتظار میں بھوکے مت بیٹھے رہیے گا۔" کنول نے ناشتے کی ٹرے محسن کے آگے رکھتے ہوئے کہا تو اس نے تیزی سے واپس مڑتی کنول کا ہاتھ پکڑ لیا۔ کنول نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا جو مصنوعی خفگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"یہ آج کل تم زیادہ ہی اپنی مرضی نہیں کرنے لگی ہو؟"

"مرضی تو کب کی آپ کی تابع ہو چکی ہے۔ میری ایسی مجال؟" کنول نے بھی شرارتاً کہا تھا۔

"ہاں وہ تو ہے! تمہارے جملہ حقوق کے ساتھ ہی تمہاری سب مرضیاں بھی میری ہو گئی تھیں' اس لیے اس سے روگردانی برداشت نہیں کی جائے گی۔" محسن نے اس کا ہاتھ زور سے دبا کر چھوڑ دیا تھا اور ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

"جی جناب' مگر آپ کی آپی اس پابندی سے آزاد ہیں۔ اسی لیے وہ یہ مرضی کر سکتی ہیں۔" کنول نے منہ بسورتے ہوئے اپنے ہاتھ کو دبایا تھا۔ محسن اپنی محبت میں بہت پوزیسو تھا۔ اس کی شدت پسندی سے کنول بہت اچھی طرح سے واقف تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ محسن بہت اچھا اور محبت کرنے والا شوہر تھا' مگر یہ بھی سچ تھا کہ اپنی پوزیسو اور شدت پسند فطرت کے آگے وہ کسی اور کو نہیں دیکھ پاتا تھا۔ دراصل شدت پسندی مثبت ہو یا منفی وہ ہمیشہ اس ان دیکھی دیوار کی مانند ہوتی ہے۔ جو ہمیں آگے بڑھنے نہیں دیتی ہے۔

کنول کے لیے کبھی کبھی بہت مشکل بھی ہو جاتی تھی جب محسن اپنی بات اور سوچ پر اڑ جاتا تھا۔ محسن کے جانے کے بعد کنول نے ناشتے کے برتن سمیٹے۔ برتن دھو کر' اپنا ناشتا بنایا اور لاؤنج میں آکر بیٹھ گئی۔ مارننگ شو پہ سرسری سی نظر ڈالتی وہ کاموں کی فہرست پہ غور کر رہی تھی جو اسے بازار جانے سے پہلے نمٹانے تھے۔ نو بجے کے قریب صفائی والی عذرا بھی آگئی۔ درمیانی عمر کی عورت تھی جو کنول کی شادی سے پہلے بھی اس گھر کی صفائی وغیرہ کر جاتی تھی۔ کنول کی شادی کو دو سال ہونے والے تھے اور وہ اپنی اس چھوٹی سی دنیا میں بہت خوش اور مگن تھی۔ کنول نے دوپہر کے کھانے کی تیاری شروع کر دی' بارہ بجے کے قریب عافیہ آپی اپنے دو پیارے اور نٹ کھٹ بچوں کے ساتھ آگئیں۔ مزمل چھ سال کا اور طوبیٰ چار سال کی تھی۔ کنول کی دونوں بچوں سے بہت دوستی تھی۔ ان کے آتے ہی سونے گھر میں رونق اور چہل پہل ہو گئی تھی۔

"چلو بچوں جلدی سے کھانا ختم کرو۔ پھر بازار بھی جانا ہے۔" عافیہ آپی نے مزمل اور طوبیٰ کو گھورتے ہوئے کہا جن کا کھانے سے زیادہ انٹرسٹ ممانی کے ساتھ باتیں کرنے میں تھا۔ وہ ڈائننگ ٹیبل پر موجود

تھے۔ کنول اپنے ہاتھوں سے چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر طوبیٰ کو کھلا رہی تھی۔ عافیہ آپی بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ بچے کھانا ختم کرتے ہی وہاں سے اٹھ گئے۔ کنول جلدی جلدی ہاتھ چلا کر برتن اٹھانے لگی۔ عافیہ آپی بھی اس کی مدد کے خیال سے ساتھ لگ گئیں۔ کنول خوش قسمت تھی کہ اسے سسرالی رشتے کے نام پہ ایک ہی قریبی رشتہ ملا تھا جو اس کے حق میں بہت اچھا اور شفیق انداز رکھتا تھا۔

عافیہ آپی محسن سے کچھ سال بڑی تھیں۔ اور اپنی شادی کے بعد فیصل آباد میں ہی مقیم تھیں۔ اس لیے آئے روز چکر لگاتی رہتی تھیں۔ کنول کو ان کا آنا اچھا لگتا تھا۔ اگر رشتوں میں تلخی اور بلاوجہ کی روک ٹوک اور تنقید نہ ہو تو وہ کبھی بھی بوجھ نہیں ہیں اور نہ ہی بوجھ کی طرح لگتے ہیں۔

"کنول ایک بات کہوں اگر برا نہ مانو تو...!" عافیہ آپی نے کچھ سوچتے ہوئے تمہید باندھی تھی۔ برتن دھوتی کنول نے چونک کر ان کی طرف دیکھا تھا۔

"جی آپی ضرور...!" کنول نے حیرانی سے کہا تھا۔

"تم لوگوں کی شادی کو دو سال ہونے والے ہیں۔ میرے خیال سے اب تمہیں ڈاکٹر سے ضرور کنسلٹ کرنا چاہیے۔ ایسے معاملوں میں زیادہ دیر مناسب نہیں ہوتی۔"

عافیہ آپی نے بالآخر وہ بات کہہ ہی دی جو کافی دنوں سے کہنا چاہ رہی تھیں۔ کنول چپ چاپ انہیں دیکھتی رہ گئی۔ پھر گہری سانس لے کر بولی۔

"عافیہ آپی میں نے یہ بات محسن سے بہت بار کی ہے مگر وہ کسی کی نہیں سنتے۔ کہتے ہیں کہ ابھی ٹائم ہی کتنا ہوا ہے۔"

کنول نے بھی دل کی بات ان سے کہی تھی کیونکہ اس کے پاس بھی فی الحال ایسا کوئی قریبی رشتہ نہیں تھا جس سے یہ سب شیئر کر سکتی۔

"اچھا تم پریشان مت ہو۔ میں محسن سے خود بات کر لوں گی۔ میری ایک جاننے والی لیڈی ڈاکٹر ہیں۔ تمہیں خود ان کے پاس لے کر جاؤں گی۔"

عافیہ آپی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔ کنول نے مسکراتے ہوئے سر ہلا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم جانتی ہو میں نے ہم دونوں کے گھر کے بارے میں کیا کیا سوچ رکھا تھا۔"

وہ اسے رخصت کروا کے پورش ایریا کے اس چھوٹے مگر خوب صورت بنے گھر میں لے آیا تھا جو کچھ دن پہلے ہی اس نے کرائے پہ لیا تھا۔ دعا کو رخصت کروا کے وہ اپنے گھر نہیں لے جا سکتا تھا جہاں ایک محاذ اس کے خلاف پہلے ہی تیار تھا۔ دوسرا اس نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا کہ دعا کو سب سے الگ رکھے گا۔ اور اس کے ساتھ پرسکون زندگی گزارے گا اور آہستہ آہستہ اپنے گھر والوں کو منائے گا۔ دعا نے خوب صورت ریڈ کلر کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ ہلکے سے میک اپ اور کانوں میں پہنے خوب صورت سے ٹاپس اور اسی ڈیزائن کا لاکٹ پہنے وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ آج اس کے تاثرات سپاٹ نہیں تھے۔ ایک گھبراہٹ اور جھجک واضح تھی۔

اس گھر میں اس کا استقبال کرنے والا کوئی نہیں تھا دعا کو ایسی کوئی امید بھی نہیں تھی۔ اس نے یہ رشتہ امیدوں یا خوابوں کی بنیاد پہ نہیں جوڑا تھا۔ اس نے رشتہ اپنی مجبوری اور ضرورت کی بنیاد پر جوڑا تھا۔ وہ زمانے اور حالات کی گردشوں کا شکار بہت عام سی لڑکی تھی۔ کوئی سپر وومن یا آئرن لیڈی نہیں تھی کہ کسی رشتے اور سہارے کے بغیر کالے خوفناک، ہوس کے پجاری بھیڑیوں کے درمیان محفوظ زندگی گزار لیتی۔ جوانی کی شام کا دورانیہ بھلے بہت مختصر سا ہوتا ہے مگر سب سے بھاری بھی یہ ہی وقت ہوتا ہے! اس لیے تو جوانی کی عبادت اور پاکیزگی کا عمل افضل ہے۔! اور اسی کا حساب بھی لیا جائے گا۔

دعا جتنا ذہنی طور پر سفر کر چکی تھی اسے سچ میں کسی سہارے، کسی ہمدم کی ضرورت تھی اور اگر کوئی محبت کا دعویدار بھی ہو تو...! چاہنے سے زیادہ چاہے جانے کا نشہ

اور خمار سر چڑھ کر بولتا ہے۔!

پورچ میں کار رکی تو اس نے دوسری طرف آکر کار کا دروازہ کھولا اور دعا کا ہاتھ پکڑ کر اسے نرمی سے باہر نکالا۔ دعا نے جھجکتے ہوئے ایک نظر اس کے مضبوط ہاتھوں پہ ڈالی تھی۔ پورچ کے ساتھ چھوٹا سا لان بھی تھا۔ بہت سے گملے بھی ایک طرف رکھے ہوئے تھے جن کی تراش خراش اور ترتیب دینے کی ضرورت تھی۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر کے اندر لے آیا۔ اور اپنی ہی ترنگ میں بولتا اسے گھر دکھانے لگا۔ گھر میں ابھی کوئی خاص سامان نہیں تھا۔ سوائے بیڈ روم کے جو آج کے دن کی مناسبت سے خوب صورت اور نفاست سے سجا ہوا تھا۔ اس بیڈ روم کے ساتھ ٹیرس بھی تھا۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر ٹیرس پہ لے گیا۔ رات کالی تھی ہمیشہ کی طرح مگر اس پہ چودھویں کا چاند سجا ہوا تھا۔ ہر سو پھیلی چاندنی اور رات کے اس پہر کہیں سے آتی رات کی رانی کی خوشبو ماحول کو سحر زدہ بنا رہی تھی۔ دعا نے اپنے اعصاب کو پر سکون ہوتے پایا تھا۔ وہ محفوظ تھی کسی کی پناہ میں تھی کوئی تھا جو اس سے محبت کے بے تحاشا دعوے کر رہا تھا۔ اس کی خوشی ایسی تھی جیسے کسی مرنے والے کو زندگی کی نوید مل جائے جیسے کسی پیاسے کو آب حیات مل جائے اس کے لیے بھی محبت کا ملنا ایسا ہی تھا۔

"ہم دونوں یہ گھر مل کر سجائیں گے۔ ہر چیز دونوں مل کر اور ایک ساتھ پسند کر کے لیں گے اور......" وہ اپنی رو میں کہہ رہا تھا۔

"اور اگر ہماری پسند مختلف ہوئی تو!" دعا نے پہلی بار لب کھولے تھے وہ چونکا کچھ سوچا اور پھر بولا۔

"کوئی بات نہیں کبھی میں کمپرومائز کر لوں گا اور کبھی تم۔"

"کیا ہر چیز پہ کمپرومائز کیا جا سکتا ہے؟" دعا نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا تھا۔ جواب الجھ رہا تھا۔ دعا کے پاس وقت اور حالات کا تلخ تجربہ اور سبق تھا جبکہ اس کے پاس اپنی محبت اور خوابوں کا خزانہ تھا! اب دیکھنا تھا جیت کس کی ہونی تھی۔

"ہاں اگر ہم چاہیں تو ہر بات ہر چیز پہ سمجھوتہ کر سکتے ہیں۔"

اس نے یقین سے کہا تھا۔ دعا نے ایک نظر اس پہ ڈالی اور پھر سامنے کی طرف رخ کر کے دور تک پھیلی چاندنی کو دیکھنے لگی۔ جبکہ وہ بہت جذب کے عالم میں اسے دیکھتا مسکرا رہا تھا۔ جو چاندنی جیسی ہی تھی۔ بھلے دنیا کے لیے وہ عام اور معمولی سی لڑکی ہو مگر اس کے دل میں ہر دم روشنی اور سکون اس کی وجہ سے پھیلتا تھا۔ بالکل اسی چاندنی کی طرح۔

"آپ جانتے ہیں دور سے دیکھنے میں ہر چیز بہت خوب صورت اور دلکش لگتی ہے۔ جیسے آسمان پہ چمکتا یہ چاند! زمین والوں کے لیے اس سے زیادہ مکمل اور خوب صورت کوئی چیز نہیں ہو گی مگر پاس جانے پہ پتا چلتا ہے کہ چاند میں گڑھے بھی ہیں اور داغ بھی!"

دعا کی بات پہ وہ چونک گیا تھا۔

"آپ نے آج تک میری خوبیاں اور ظاہری تصویر دیکھ کر محبت کا دعوا کیا ہے مگر جب کسی کے ساتھ مستقل رہنا پڑے تب اندازہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی محبت میں کہاں تک سچے اور مضبوط تھے۔"

"کم آن دعا! میری محبت اتنی کمزور نہیں ہے۔ اتنا تو میں بھی سمجھتا ہوں کہ انسان خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہے! تم تاریک پہلو دیکھنے کے بجائے روشن پہلو کیوں نہیں دیکھتی ہو۔"

اس نے چٹکیوں میں دعا کی بات اڑائی تھی۔ دعا نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا تھا جس کے چہرے پہ یقین واضح تھا۔

"سمجھنے اور برتنے میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی کو جاننے اور اس کے ساتھ رہنے میں بہت فرق ہوتا ہے اور یہ فرق کیا ہے وہ آج کے بعد آپ جانیں گے۔ میری دعا ہے کہ میرا تجربہ غلط نکلے اور آپ کا یقین سچ! کبھی کبھی دل چاہتا ہے ناکہ سب جھوٹ بھی سچ ہو جائیں اور ہم اپنے وہم و گمان سے ہار جائیں کیونکہ ان سے ہارنے کا دکھ کبھی بھی نہیں ہوتا ہے۔"

دعا نے سنجیدگی سے کہا اور مڑ کر اندر کی طرف چلی گئی تھی۔ وہ جو اس کی باتوں کے جال میں الجھ گیا تھا۔ سر جھٹک کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ دعا کو یقین وقت کے ساتھ ہی آئے گا۔ اسے بس صبر اور تحمل سے کام لینا تھا اور اپنی محبت کو آزمانا تھا۔ جبکہ یہ نہیں جانتا تھا کہ محبت کو آزمایا نہیں جاتا ہے بلکہ محبت خود آزماتی ہے، کبھی لے کر اور کبھی دے کر۔ اور محبت اسے دے کر آزمانے والی تھی۔!!

☼ ☼ ☼
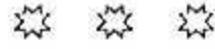
"کنول سب ٹھیک تو ہے آپ اور یہاں!" اسپتال کے ویٹنگ روم میں کنول کو بیٹھے دیکھ کر شیری نے پاس آکر بے اختیار پوچھا تھا۔ اپنی سوچوں میں گم کنول نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ عافیہ آپی طوبی کو لے کر واش روم گئی تھیں۔ وہ اس اسپتال کی مشہور گائنا کالوجسٹ سے اس کا چیک اپ کروا رہی تھی۔ عافیہ آپی نے محسن کو کس طرح سمجھایا، کنول نہیں جانتی تھی مگر اس کے لیے اتنا ہی بہت تھا کہ محسن مان گیا تھا۔

"جی سب ٹھیک ہے وہ میں اپنی نند....." کنول کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اسے کیا بتائے جب ایک وجیہہ اور اسمارٹ سے بندے نے آکر شیری کو متوجہ کیا۔ شیری نے گرم جوشی سے اسے گلے لگایا اور مبارکباد دی۔ اس کا نام احمد علی تھا اور کنول کو ان دونوں کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ احمد کو اولاد کی خوشی ملی ہے اور اس کی بیوی یہاں ایڈمٹ ہے۔ شیری اسی لیے وہاں آیا تھا۔ شیری نے کنول کا تعارف احمد سے بھی کروایا پھر اسے خدا حافظ کہتے ہوئے احمد کے ساتھ چلا گیا۔

"یہ کون تھا؟" عافیہ آپی نے پاس آتے ہوئے پر تجسس لہجے میں پوچھا تھا۔

"میری بیسٹ فرینڈ ہما کے بھائی ہیں۔ اسی شہر میں جاب کرتے ہیں۔"

کنول نے آہستگی سے تفصیل بتائی۔ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا کہ پتا نہیں رپورٹس میں کیا آتا ہے؟ ڈاکٹر کیا کہتی ہے؟ تھوڑی دیر بعد ان کا نمبر آگیا۔ کنول دل ہی دل میں ڈرتی ڈاکٹر کے کمرے کی طرف بڑھی تھی۔

☼ ☼ ☼

"پلیز کنول اب بس بھی کرو۔ کتنے ہی دن ہو گئے ہیں تمہارا یہ سنجیدہ اور رویا رویا سا موڈ دیکھتے ہوئے۔"

محسن نے ٹی وی پہ نظریں جمائیں بیٹھی گم سم سی کنول کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔ محسن کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔

"دیکھو کنول! اس طرح رونے دھونے سے کچھ نہیں ہو گا۔ الٹا تم بیمار اور ڈپریشن کی مریض بن جاؤ گی۔ پلیز سنبھالو خود کو۔"

محسن نے نرمی سے اس کے آنسو صاف کیے تھے۔ کنول اس کا ہاتھ تھام کر رو پڑی۔

"ڈاکٹر نے کہا ہے کہ میرے ماں بننے کے چانسز بہت کم ہیں۔ شاید کوئی علاج، یا معجزہ ہی ہو۔"

کنول نے وہ بات پھر دہرائی جو اس کا دل چیرے جا رہی تھی۔ عافیہ آپی کے لیے بھی یہ شاکڈ تھا۔ محسن ان کا اکلوتا بھائی تھا۔ کنول لاکھ اچھی سہی مگر انہیں اپنے بھائی کی خوشیوں سے آگے تو نہیں تھی۔

"اندھیرے کو ختم کرنے کے لیے روشنی کی ایک کرن، چھوٹا سا ایک جگنو بھی بہت ہوتا ہے۔ اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو، ہم بڑے سے بڑے ڈاکٹر سے کنسلٹ کریں گے۔ دعا کریں گے ابھی سے ناامید مت ہو۔"

محسن نے روتی بلکتی کنول کو دلاسا دیا تھا۔ جو بری طرف خوفزدہ اور پریشان تھی۔ عافیہ آپی کی چپ وہ محسوس کر چکی تھی۔ محسن اپنی بہن سے بہت محبت کرتا تھا اور ان کی ہر بات سر آنکھوں پہ رکھتا تھا۔ اگر انہوں نے کچھ ایسا ویسا محسن سے کہہ دیا تو.... یہ سوچیں ہی کنول کی ہمت توڑ رہی تھیں۔

"محسن آپ مجھے چھوڑ تو نہیں دیں گے؟" کنول نے وہ سوال کر ہی دیا جو اسے اندر ہی اندر کھا رہا تھا۔ محسن نے ایک نظر اس کے ڈرے اور گھبرائے ہوئے

چہرے کی طرف دیکھا۔ اور نرمی سے بولا۔
"اپنے دل سے سب اندیشے' ڈر' خوف نکال دو۔ میاں بیوی کا رشتہ صرف سکھ کا ہی نہیں ہوتا ہے' دکھوں کی تپتی دوپہریں بھی مل کر کاٹنی ہوتی ہیں۔"
محسن کی یقین دہانی پہ کنول کا دل ٹھہرا ضرور تھا مگر اس کی اداسی اور پریشانی کم نہیں ہوئی تھی۔ ان دنوں وہ شدید گھٹن اور حبس کا شکار تھی۔ عافیہ آپی اب آتیں بھی تو' محسن کے ساتھ کمرہ بند کرکے میٹنگ کرتی رہتیں۔ کنول سے ان کا رویہ کافی حد تک سرد ہو چکا تھا۔ محسن' کنول کو لے کر لاہور کے مشہور اسپتال بھی جا چکا تھا۔ جہاں کے قابل ڈاکٹرز کی زیر نگرانی اس کا علاج ہو رہا تھا۔ ڈاکٹرز مکمل طور پر مایوس نہیں تھے۔ بس اللہ کے حکم اور حکمت کے منتظر' اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔
ان حبس زدہ اور گھٹن میں ایک دریچہ کنول کے لیے کچھ دیر کے لیے ہی سہی تازہ ہوا کا جھونکا ضرور لے آتا تھا۔ وہ تھا شیری کے آنے والے مختلف ایس۔ ایم۔ ایس عام اور معمولی باتوں سے بھرے یہ **میسجز** کنول کو پرسکون کر دیتے تھے۔ شیری کی ہلکی پھلکی' مزاحیہ سی باتوں میں کھو کر وہ اکثر گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتی تھی۔ زیادہ تر یہ **میسجنگ** تب ہوتی تھی جب کنول گھر میں اکیلی ہوتی تھی۔
ہما کی شادی' قریبی سسرالی رشتہ دار کی اچانک موت کی وجہ سے ملتوی ہو چکی تھی۔ اور اکثر ہما کی باتوں کی وجہ سے ہی شیری **میسجز** کرتا تھا جس کی وجہ سے کنول جواب دے دیتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ ہما' سے ہٹ کر بھی باتیں ہونے لگی تھیں۔ کنول کی نیت میں کوئی فتور نہیں تھا۔ چونکہ وہ اپنی شادی سے پہلے سے شیری کو جانتی تھی۔ اس سے باتیں' ہنسی مذاق کرتی تھی اس لیے اسے اب بھی ایسا کرنے میں کوئی برائی نظر نہیں آئی! اگر یہاں آکر اس کی سوچ رک سی گئی تھی اس لیے کہ اب وہ کسی کی بیوی تھی۔ اور شوہر کے علم میں لائے بغیر کسی سے ایسا رابطہ رکھنا گناہ تھا۔ مگر کنول نے محسن سے کبھی کچھ چھپایا نہیں تھا تو اسے کچھ بتایا بھی نہیں تھا۔ ہما کی شادی ملتوی ہونے کا شیری نے بھی بتایا تھا اور ہما نے بھی۔ اور یہ سب محسن کے سامنے کی باتیں تھیں۔ مگر آہستہ آہستہ یہ دوستی بڑھتی جائے گی اس کا اندازہ نہ محسن کو تھا اور نہ کنول کو۔! کنول نے اس مشکل وقت میں اپنے رب سے رجوع کرنے کے بجائے' وہ راستہ چنا تھا جو اس کا نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

"شمائلہ آپی کچھ دن اور رک جاتیں تو ہمارے ولیمہ کی تقریب میں بھی شامل ہو جاتیں۔"
اس نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اپنے ساتھ نفاست سے تیار بیٹھی دعا کو دیکھ کر کہا تھا۔ جو گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ اس کے پکارنے پہ چونک کر اپنے خیالوں سے باہر آئی تھی۔
"ان کی فیملی نے پہلے ہی بہت انتظار کیا ہے میری وجہ سے!"
اس نے سرد لہجے میں کہا تھا۔
"کیا وہ اس شادی سے خوش نہیں تھیں؟"
"ایک وہ ہی ہیں جو اس شادی سے سب سے زیادہ خوش ہوئی ہیں۔ اس لیے تو سب کچھ "فورا" بھگتا دیا۔ جیسے کوئی بوجھ ہوں میں۔"
دعا نے یاسیت سے کہتے ہوئے' آخری جملہ بہت آہستگی سے کہا تھا۔ مگر وہ سن چکا تھا۔
"خیر مجھ سے زیادہ کس نے خوش ہونا تھا اس شادی سے' اور اگر ہم دونوں ایک دوسرے کو پا کر خوش ہیں تو دنیا کی کیا پروا۔"
اس نے گاڑی روک کر دعا کے لیے گجرے لیے تھے۔ اسے پہناتے ہوئے مسکرا کر بولا تھا۔
"یہ آپ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ آپ کی فیملی بھی اس شادی سے خوش نہیں ہے کیا سچ میں آپ کو ان کی پروا نہیں ہے یا آپ نے ان کو یاد نہیں کیا اس موقع پہ۔"
دعا نے نرمی سے پھولوں کو چھوتے ہوئے بظاہر

سرسری مگر بجھتے ہوئے لہجے میں پوچھا تو اس کی ہنسی ایک دم غائب ہو گئی اور وہ سیدھا ہو کر خاموشی سے کار ڈرائیو کرنے لگا۔ مگر اس کے چہرے پہ پھیلا اضطراب بتا رہا تھا کہ دعا کی بات سچی ہے اور اس کے دل کو لگی ہے۔ وہ بھلے ظاہر نہ کرتا مگر اپنی زندگی کے اس اہم مرحلے پہ قدم دم پہ ماں، باپ، بہن بھائیوں کی کمی محسوس کی تھی۔ مگر اسے یہ یقین تھا کہ کچھ وقت کے بعد وہ سب کو منا ہی لے گا۔

"مجھے میری بات کا جواب مل گیا ہے۔"

دعا نے گہری سانس لے کر آہستگی سے کہا تھا۔ ہوٹل کی پارکنگ میں کار رکی تو اترنے سے پہلے دعا بولی۔

"میں شرمندہ ہوں اپنی بات کے لیے مگر میں کیا کروں میں وقت اور حالات کے تجربے سے گزری ہوئی عورت ہوں جو سچ اور جھوٹ میں فرق کرنا اچھی طرح جانتی ہے۔ میں ناسمجھ لڑکی کی طرح خوابوں کی دنیا میں نہیں رہ سکتی ہوں۔"

"اب چلیں!" اس نے دعا کی بات کا جواب دینے کے بجائے اندر کی طرف چلنے کا اشارہ کیا تھا۔ جہاں اس کے چند قریبی دوست اور کولیگز اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ، ان کے منتظر تھے!!

☆ ☆ ☆

سب کاموں سے فارغ ہو کر کنول اداس اور بد دل سے گھر کے چھوٹے صحن میں آ گئی۔ گملے میں لگے پودوں کو دیکھتی وہ بے معنی سی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی۔ اسے علاج کرواتے ہوئے چھ مہینے ہو چکے تھے مگر ابھی بھی کوئی امپرومنٹ نہیں ہوئی تھی۔ ڈاکٹرز کے مطابق یہ ایک لمبا سلسلہ تھا۔ اس میں صبر اور برداشت چاہیے تھا۔ اور دوسرا سب سے بڑا مسئلہ، پیسہ بھی ٹھیک ٹھاک لگتا تھا۔ دوائیاں، انجکشن، مختلف کورسز جس کے لیے اچھی خاصی اضافی رقم چاہیے ہوتی تھی۔

محسن کی تنخواہ اچھی تھی۔ فی الحال تو وہ خوش اسلوبی سے یہ ذمہ داری نبھا رہا تھا مگر عافیہ آپی کے تیور یکسر بدل چکے تھے۔ وہ اب برملا محسن کو سمجھانے اور کنول پہ تنقید کرنے لگی تھیں۔ کنول کی بدقسمتی یہ تھی کہ میکے میں والدین جیسا مضبوط رشتہ کئی سال پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ والدین حیات نہیں تھے۔ حمزہ بھائی اپنی فیملی کے ساتھ پردیس میں جا بسے تھے۔ یہاں ایسا کوئی قریبی نہیں تھا جس سے کنول اپنے دل کی باتیں کرتی۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ محسن ابھی تک آفس سے نہیں لوٹا تھا۔ کنول وہاں بیٹھ کر ہی محسن کا انتظار کرنے لگی۔ اور اسی کے بارے میں سوچنے لگی۔

محسن اسے لے کر بہت پوزیسو تھا۔ اسے پسند تھا کہ کنول اس کی مرضی اور بنائی گئی لائن کے مطابق چلے۔ کنول کو یہ بات پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ مگر جیسے جیسے آزمائش بڑھتی جا رہی تھی اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ پوزیسو ہم سفر کے ساتھ رہنا، بعض اوقات کتنا مشکل اور کٹھن ہو جاتا ہے۔ ان کی محبت پہ شک نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنی محبت میں جتنے خالص ہوتے ہیں، اتنا ہی زیادہ انتہا پسند بھی ہوتے ہیں۔ اور ایسی انتہا پسندی اکثر و بیشتر سانس لینے والے روزن ضرور بند کر دیتی ہے۔ کنول ذہنی اور جسمانی جس تکلیف سے گزر رہی تھی اسے اپنے دل کی بات کہنے، سننے اور سمجھنے والا فرد چاہیے تھا۔

ہوتا ہے نا کہ زندگی میں کہیں ہم ایسے الجھ جاتے ہیں کہ وہاں اپنے ہم سفر سے محبت سے زیادہ، انڈر اسٹینڈنگ، ہمدردی جیسے رویوں کی توقع زیادہ ہوتی ہے۔ مگر زندگی کے ہر معاملے میں انتہا پسندی جیسا رویہ رکھنے والے، کمزور اور منہدم ہوتی عمارت پہ اتنا وزن ڈالتے ہیں کہ نہ وہ عمارت بچتی ہے اور نہ وہ خود قائم کھڑے رہ پاتے ہیں۔ اسی وقت کنول کے موبائل کی میسج ٹون بجی۔ تیری کا میسج دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"دو نیوز ہیں آپ کے لیے ایک اچھی اور ایک بری۔"

"اچھا وہ کیا؟" کنول نے تجسس سے پوچھا تھا۔ کچھ سیکنڈ کے بعد ہی جواب آگیا۔
"خوشی کی خبر یہ ہے کہ ہما کی شادی اگلے مہینے ہو رہی ہے اور بری خبر یہ ہے کہ میری ٹرانسفر لاہور ہو گیا ہے۔ آپ کے شہر کو الوداع کہنا پڑے گا بہت جلد۔"
میسج پڑھ کر کنول مسکرا دی۔ ہما کی شادی کا سن کر اسے دلی خوشی ہوئی تھی۔
"آپ کی لاہور ٹرانسفر ہو گئی ہے یہ تو خوشی کی بات ہے۔ آپ کی سب فیملی وہاں ہی ہے۔" کنول نے میسج لکھ کر سینڈ کر دیا۔
"ہوں۔ ! کیا سچ میں یہ خوشی کی بات ہے آپ کے لیے۔" کچھ وقفے کے بعد میسج آیا تو کنول کچھ الجھ کر سوچ میں پڑ گئی۔
"ہاں تو...." کنول نے جواب دیا۔
"اچھا مان لیا۔" اسمائلنگ فیس کے ساتھ جواب آیا تو کنول سر جھٹک کر رہ گئی۔ اسی وقت محسن کی کار کا ہارن سنائی دیا۔ تو کنول "فوراً" سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ خود کو سنبھالتی چہرے پہ مسکراہٹ سجائے' اس کا استقبال کرنے کو تیار کھڑی ہو گئی کہ سارے دن کے تھکے ہارے شوہر کو روتی' بسورتی بیویاں اچھی نہیں لگتی ہیں۔

☼ ☼ ☼

"اچھا آپ لوگوں کی لو میرج ہے؟ کب... کیسے کہاں.... ملے تھے آپ لوگ؟ ویسے سچ کہتے ہیں کہ محبت کچھ نہیں دیکھتی۔ کسی فرق' کسی اونچ نیچ کو نہیں مانتی! کیا شادی میں کوئی شریک نہیں ہوا؟"
اس طرح کے اور اس سے ملتے جلتے کئی سوال ان دونوں نے بظاہر ہمدردانہ' مسکراتے چہروں سے سنے۔ لوگ ہمدردی میں' ہنسی مذاق میں بہت کچھ کہہ رہے تھے۔ جسے دعا سن کر مسکرا کر نظر انداز کر رہی تھی۔ یہ ہی حال اس کا بھی تھا۔ وہ بہت قریبی دوست تھے۔ جن کے تبصرے بے لاگ تھے۔ وہ سب کے منہ نہیں بند کر سکتا تھا۔ آج اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ کہنے میں اور دنیا میں اصل میں فیس کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا تھا۔
واپسی پہ دعا نارمل ہی تھی۔ مگر اس کا موڈ سنجیدہ تھا۔ دعا کچھ مہینے پہلے اس سے بھی برے رویوں سے گزر چکی تھی۔ مگر اس کے لیے یہ نیا تجربہ تھا۔ سب سے زیادہ حیرانی کا اظہار ان دونوں کے ہائٹس کے فرق کو دیکھ کر ہوئی تھی۔ دعا کا قد پانچ فٹ چھ انچ تھا۔ اور وہ بہت کمزور یا اسمارٹ لڑکیوں میں نہیں آتی تھی۔ جبکہ اس کی نسبت وہ کافی اسمارٹ تھا۔ اور اپنی جسمانی ساخت کی وجہ سے دعا سے چھوٹا لگتا تھا۔ جبکہ دونوں میں عمروں کا زیادہ فرق نہیں تھا۔ مگر عورت اپنی عمر سے کچھ سال بڑی ہی نظر آتی ہے۔
محبت کو پا لینے کے بعد' یہ حقیقت کا پہلا چابک اسے پڑا تھا کہ کچھ دیر کے لیے ہی سہی وہ بلبلا کر رہ گیا تھا۔ مگر ابھی تو ابتدا تھی۔ وقت کے جلاد کے پاس' تلخ سچائیوں کے چابک بے شمار پڑے تھے۔
"آئس کریم کھاؤ گی؟" اس نے ماحول کی سنجیدگی کو کم کرنے کے لیے ہلکے پھلکے سے انداز میں پوچھا تھا۔ دعا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ آئس کریم کھانے کے بعد جب وہ دونوں گھر پہنچے تو ذہن سے ہر بات کی تلخی کم ہو چکی تھی۔ ایک بار پھر وہ تھے اور ان کی بنائی چھوٹی سی جنت! جس کو دونوں مل کر سجا رہے تھے۔ سنوار رہے تھے ہر گزرتے دن کے ساتھ ساتھ۔

☼ ☼ ☼

"محسن تم کب تک خود کو جھوٹی تسلی دیتے رہو گے؟ جانتے بھی ہو کہ کامیابی کے چانس بہت کم ہیں پھر بھی اپنا وقت اور پیسہ ضائع کر رہے ہو؟"
عافیہ آپی آج فیصلہ کر کے آئی تھیں کہ محسن کو سمجھا کر ہی جائیں گی۔
"عافیہ آپی پلیز! آپ بھی صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ جو ہر وقت کنول کی تعریفوں کے پل باندھا کرتی تھیں اب اسی میں خامیاں نکالنے لگی ہیں صرف ایک بات کو جواز بنا کر۔"

محسن نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ وہ عافیہ آپی کے بدلتے رویئے کو کافی عرصے سے دیکھ رہا تھا۔

"اس میں لاکھ خوبیاں ہوں مگر وہ تمہیں اولاد کی خوشی نہیں دے سکتی ہے! ایسی بانجھ عورت کا کیا کرنا۔"

عافیہ آپی نے تنفر سے کہا تو محسن ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ اور جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپی! آپ میرے لیے بہت قابل احترام ہیں۔ مگر میں کنول کے لیے بھی یہ سب کچھ نہیں سن سکتا ہوں۔ براہ مہربانی دوبارہ یہاں آئیں تو خود کو بدل کر، پہلے والی عافیہ آپی بن کر آئیں۔"

محسن کمرے سے باہر نکل گیا۔ جبکہ عافیہ آپی اس کے لفظوں پہ ساکت رہ گئی تھیں۔

"اس بانجھ عورت کی وجہ سے، اپنی محبت کرنے والی، سگی بہن کو اپنے گھر آنے سے منع کر رہا ہے۔ خدا پوچھے گا اس سے۔ جس نے میرا بھائی چھین لیا۔"

عافیہ آپی کوستی، بددعائیں دیتی وہاں سے چلی گئیں۔ کنول سفید چہرہ لیے سب سنتی رہی۔ محسن نے اس کے ٹھنڈے پڑتے ہاتھوں کو تھاما تو کنول بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ محسن نے اسے کچھ دیر رونے دیا۔ تاکہ اس کے دل کا غبار نکل جائے۔

"کنول! اب بس رونا نہیں ہے! اگر مشکل وقت میں آپ کا ساتھ دینے والا ہو تو اس ذات پہ یقین کامل رکھتے ہیں کہ جس نے مشکل وقت میں اکیلا نہیں چھوڑا، رونے کے لیے کسی مہربان کا کندھا عطا کیا زندگی میں اس سے بڑی بھی کوئی نعمت ہوتی ہوگی۔"

محسن کے لفظوں نے کنول کے دل کو ڈھارس دی تھی۔ وہ یکدم چپ ہوگئی۔ محسن نے اس کا بھیگا چہرہ اوپر اٹھایا اور بولا۔

"اب کوئی رونا دھونا نہیں۔ مضبوط بنو یار! اور شاباش اپنا موڈ ٹھیک کرو۔ اس ہفتے ہم لاہور جا رہے ہیں۔"

محسن نے کہا تو اپنی ہی سوچوں میں الجھی کنول نے جواب دیا۔

"مگر ڈاکٹر سے کوئی اپائنٹمنٹ تو نہیں ہے اس ہفتے پھر لاہور کیوں جانا ہے؟"

"وہ اس لیے کہ آپ بھول رہی ہیں کہ آپ کی بیسٹ فرینڈ ہما کی شادی ہے۔ مہندی میں تو شرکت ممکن نہیں ہے۔ مگر ہم اس کی بارات کا فنکشن اٹینڈ کر ہی لیں گے۔ ایک رات کسی ہوٹل میں گزار لیں گے صبح واپسی۔" ٹھیک ہے ناں! اب چلو مسکرا کر دکھاؤ۔"

محسن نے سارا طے شدہ پروگرام اسے بتاتے ہوئے آخر میں شرارت سے کہا تو کنول دھیرے سے مسکرا دی مگر اس کی آنکھوں آنسوؤں سے لبالب بھر گئیں وہ جانتی تھی کہ محسن نے یہ پروگرام صرف اس کی خوشی کے لیے ترتیب دیا ہے۔ ورنہ پہلے وہ جانے سے صاف منع کر چکا تھا کہ رات کو کہاں ٹھہریں گے۔ مگر اب کنول کو اداسی اور یاسیت سے نکالنے کے لیے اس کو یہ آئیڈیا اچھا لگا تھا۔ سب کچھ ٹھیک تھا مگر قسمت کی لگی گھاتوں سے کون باخبر رہا ہے، کون بچ پایا ہے!

☼ ☼ ☼

دعا جس نے یہ شادی اپنی مجبوری اور ضرورت کے تحت کی تھی۔ آہستہ آہستہ کر کے دل سے اس رشتے کو قبول کرنے لگی تھی۔ وہ اس سے محبت کرتا تھا، اس کا خیال رکھتا تھا، آؤٹنگ پہ لے کر جاتا تھا۔ فارغ وقت میں اس کے ساتھ گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کرتا رہتا تھا۔ دعا جو پہلے اس کی باتوں کو سرسری سا سنتی تھی آہستہ آہستہ ان میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ دراصل یہ وہ وقت تھا جب اسے دعا کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ دعا کو آئس کریم بہت پسند تھی۔ روز رات کو اسے آئس کریم کھلانے کے بہانے لانگ ڈرائیو پہ یا واک پہ لے جاتا تھا۔ ان دنوں وہ اپنے گھر والوں سے بہت دور ہو چکا تھا۔ مگر پھر بھی وہ اپنے گھر کی ذمہ داری بہت ایمانداری سے پوری کر رہا تھا۔ اور مہینے میں ایک دو بار ماں، باپ سے ملنے بھی چلا جاتا تھا۔

ماں جو پہلے اسے دیکھ کر منہ پھیر لیتی تھیں۔ اب اکثر اس کا انتظار کرتیں۔ اسے خود فون کر کے بلا لیتیں۔ اور ایسا زیادہ تر ویک اینڈ پہ ہوتا تھا جب تینوں بہنیں بھی میکے آئی ہوتیں ان تینوں کے بچوں میں اس کی جان تھی۔ دراصل اسے بچوں سے بہت پیار تھا۔ اور اب بھی وہ ان سب سے ملنے کے لیے بھاگا آتا تھا 'دعا نے کبھی اس بات پہ کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ وہ خود رشتوں کی ٹھکرائی اور ترسی ہوئی تھی اس لیے ان رشتوں کی اہمیت کو سمجھتی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ زیادہ عرصہ اپنی فیملی سے دور نہیں رہ پائے گا۔ اس نے صرف یہ دیکھنا تھا کہ کیا وہ اسے بھی اپنی فیملی سے متعارف کروائے گا یا نہیں! اپنے دعوؤں کے مطابق اس کی جگہ بنا سکے گا یا نہیں!

دوسری طرف راحت بیگم زیادہ عرصے تک اپنے بیٹے سے خفا نہیں رہ پائی تھیں۔ وہ ماں کو منانے اور ان کی ناراضی دور کرنے کے لیے آئے روز وہاں کے چکر لگاتا اور ماں باپ کے ساتھ وقت گزارتا۔ ان کا خیال رکھتا۔ بہنوں کے خفا ہونے کے باوجود پہلے کی طرح ان سے ملتا۔ بچوں کے ساتھ ہلا گلا کرتا۔ اس دوران اس کا سامنا اکثر و بیشتر عظمی سے بھی ہوتا رہتا! جو اس کی محبت میں ڈوبی 'اس کے ارد گرد چکر لگاتی رہتی تھی۔ خالہ اور ان کے گھرانے سے اسے بہت لگاؤ تھا۔ پھر جب اسے پتا چلا کہ اس نے اسی گھر میں آنا ہے تو اس لگاؤ میں مزید اضافہ ہوا۔ مگر وقت نے ایسا داؤ کھیلا کہ سب الٹ پلٹ ہو گیا۔ مگر اپنی محبت اور خوابوں سے دستبردار ہونا آسان نہیں ہوتا ہے اور یہ ہی جوگ عظمی لے بیٹھی تھی۔ کیونکہ سب ہی اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہیں۔

راحت بیگم مایوس نہیں تھیں انہیں یقین تھا کہ وہ واپس ضرور پلٹے گا۔ بس ذرا صبر سے کام لیتا تھا۔ یہ قانون فطرت ہے کہ ہر چیز اپنے اصل کی طرف ضرور پلٹتی ہے۔

☆ ☆ ☆

محسن کا فیصلہ درست ثابت ہوا تھا۔ کچھ دیر کے لیے ہی سہی کنول شادی میں آ کر سب بھول گئی تھی۔ محسن ایک کونے میں بیٹھا کنول کو دیکھ رہا تھا جو ڈیجیٹل کیمرہ ہاتھ میں پکڑے اسٹیج کی طرف بڑھی تھی۔ اس کا خوب صورت کلچ اور موبائل میز پر پڑا ہوا تھا۔ محسن یہاں کسی کو نہیں جانتا تھا۔ اس لیے بور ہو رہا تھا۔ اسی بوریت سے تنگ آ کر اس نے اپنی پسندیدہ گیم کھیلنے کے لیے کنول کا موبائل اٹھا لیا۔ اس کے موبائل میں یہ گیم ڈاؤن لوڈ نہیں تھی۔ بے ارادہ ہی اس نے میسجز کھول لیے۔ یوں ہی سرسری نظر ڈالتا وہ چونک گیا۔ شیری کے نام سے محفوظ نمبر کے میسجز کو کھولا۔ اور وہ حیران رہ گیا۔

"اتنے عرصے سے دونوں رابطے میں رہے ہیں اور مجھے کبھی بتایا ہی نہیں کنول نے۔"

محسن کے دماغ کی رگیں تن گئیں۔ حالانکہ میسجز میں کوئی بھی قابل گرفت بات نہیں تھی مگر جو بھی تھا یہ محسن کے علم میں نہیں تھا اور اسی بات کا غصہ محسن کا دماغ خراب کرنے لگا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور کنول کو تلاشتا آگے بڑھا تو وہ اسے شیری کے ساتھ کھڑی ہنستی ہوئی نظر آئی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس تک پہنچا۔ کنول نے ہنستے ہوئے بے ارادہ اس پہ نظر ڈالی تو چونک گئی۔ محسن کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر کنول کا دل دھک دھک کرنے لگا تھا۔ کنول کو یکدم چپ دیکھ کر شیری بھی چونکا۔ پھر محسن پہ نظر پڑتے ہی بے اختیار آگے بڑھ کر بولا۔

"بہت بہت شکریہ آپ اتنی دور سے خاص طور پر آئے۔"

محسن نے ایک سرد نظر اس پہ ڈالی اور کنول کی طرف دیکھ کر بھنچے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"چلیں۔!" اور تیزی سے واپسی کے لیے مڑ گیا کنول ہلکے ہلکے سے اس کے پیچھے بھاگی جبکہ شیری پریشان نظروں سے انہیں جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

محسن رکیں میری بات تو سنیں؟ آپ کا موڈ یکدم کیوں آف ہو گیا ہے؟ کیا کسی نے کچھ کہا ہے؟

محسن نے اس کی بات کا جواب دیئے بغیر چلتا رہا۔

اور کار کے پاس پہنچ کر غصے سے دروازہ کھولا۔ اور زور سے بند کیا۔ کنول بھی جلدی سے بیٹھ گئی تھی۔ محسن نے تیزی سے گاڑی موڑی اور زن سے چلا کر لے گیا۔ پیچھے اڑنے والی دھول رہ گئی تھی اور اس دھول میں کیا کیا گم ہونا تھا ابھی وہ باقی رہتا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ گھر میں داخل ہوا تو سارے گھر میں پھیلی خاموشی اسے بہت عجیب لگی تھی۔ آج روز کی طرح دعا نے اسے دروازے پہ ویلکم نہیں کہا تھا۔ اپنی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا وہ دعا کو آواز دینے لگا۔ مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ پریشان ہو کر سارے گھر میں ڈھونڈنے لگا۔ عجیب اندیشے سے ستانے لگے تھے۔ بیڈروم بھی خالی پڑا تھا۔ کچن کی لائٹس بھی آف تھیں۔ لاؤنج میں خاموشی اسی وقت ہلکے سے میوزک کی آواز آئی تو وہ آواز کی سمت چلتا ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ جہاں کی لائٹس بھی آف تھیں۔ مگر اندر پہنچ کر وہ بری طرح چونک گیا تھا۔ اندھیرے میں خوب صورت کینڈلز سے ہوتی روشنی' سینٹرل میز کے پاس نیچے کشن پہ بیٹھی خوب صورتی سی تیار' اپنے لمبے اور گھنے بالوں کو نفاست سے سیٹ کرکے گردن کے دائیں طرف ڈالا ہوا تھا اور وہ ہاتھ میں پکڑی چھوٹی موم بتی سے کیک پہ لگی چھوٹی چھوٹی موم بتیاں روشن کر رہی تھی۔ بیک گراؤنڈ میں بجتا رومانٹک میوزک' اس کا پسندیدہ تھا۔ کیک کے اطراف میز سرخ پھولوں سے سجے ہوئے تھے۔ وہ مبہوت سا ہو کر رہ گیا اور دھیرے دھیرے چلتا اس تک پہنچا تھا۔ اور اس کے سامنے ہی نیچے قالین پہ رکھے کشن پہ بیٹھ گیا تھا۔

"سالگرہ مبارک ہو!"

اس نے آہستگی سے کہا تو موم بتیوں کی روشنی میں چمکتے اس کے چہرے کو دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

"تم ساتھ ہو تو ہر لمحہ' ہر پل روشن ہے میرے لیے!" اس نے کہا تو وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ ایسے ہر دعوے پہ وہ اسی طرح سوچ میں پڑ جاتی تھی۔ نجانے کیوں مگر اسے لگتا تھا کہ جیسے یہ دعوے برف کی ڈلی کی طرح ہوتے ہیں جو ذرا سی تمازت سے پگھل کر پانی بن کر بہہ جاتے ہیں۔ پیچھے نہ نشان رہتا ہے اور نہ ثبوت!

"یہ نہیں کہو گی کہ ہیپی برتھ ڈے مائی ڈیئر ورلڈ بیسٹ ہزبینڈ (دنیا کے بہترین شوہر کو سالگرہ مبارک)" اس نے دعا کی خاموشی پہ شرارت سے کہا تھا۔

"نہیں! عورت وہ مرد نہیں چاہتی ہے جو ساری دنیا میں اچھا ہو! عورت اس مرد کو چاہتی ہے اس کے سامنے خود کو ہارتی ہے جو اس کے لیے' اس کے حق میں ساری دنیا کی نسبت اچھا ہو! مضبوط پناہ گاہ کی طرح ہو کسی چٹان کی طرح۔"

دعا نے گم صم سے لہجے میں کہا تو وہ خاموش ہو گیا۔ دعا کو ماحول کی سنجیدگی کا احساس ہوا تو فوراً" لہجے کو ہلکا پھلکا بناتے ہوئے بولی۔ "جلدی سے کیک کاٹیں۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

دعا کے کہنے پہ اس نے موم بتیاں بجھائے بغیر ایک طرف سے تھوڑا سا پیس کاٹا اور ہاتھ بڑھا کر دعا کو کھلانے لگا۔

"پہلے موم بتیاں تو بجھا لیتے۔"

دعا نے ہنستے ہوئے اسے یاد دلایا تھا۔

"نہیں انہیں روشن رہنے دو! ان کی روشنی اسی طرح تمہارے چہرے پہ پڑتی رہے اور جگمگاتی رہے۔ اس سے خوب صورت منظر ابھی ان آنکھوں نے نہیں دیکھا ہے اور وہ کہتے ہیں ناکہ "ایک بار دیکھا ہے' بار بار دیکھنے کی ہوس ہے' کچھ ایسا ہی معاملہ سمجھ لو۔" اس کے کہنے پہ دعا بے یقین لہجے میں بولی تھی۔

"آپ مجھے کبھی چھوڑ تو نہیں دیں گے؟"

"جس کے لیے سب چھوڑا جاتا ہے ناں' اسے کیسے چھوڑا جائے؟ جب اس بات کو سمجھ لو گی تو اپنے اندر کے ڈر کو بھی شکست دے سکو گی۔" اس نے سکون لہجے میں کہتے ہوئے' تھوڑی سی کریم اس کی ناک پہ لگا دی تھی۔

"آئی سمجھ میں محترمہ!!" دعا مسکراتے ہوئے اپنے

حال میں لوٹ آئی تھی۔ پھر ایک اچھے سے ڈنر اور لانگ ڈرائیو سے واپسی پہ' اس کے ہاتھوں میں گجرے پہناتے ہوئے اس نے اعتراف کیا تھا۔

"یہ میری زندگی کی سب سے بہترین سالگرہ تھی اور اس فرد کے ساتھ جسے میں خود سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔"

دعا نے پھولوں کی خوشبو چاروں طرف پھیلتی' جھومتی گنگناتی' کھلکھلاتی محسوس کی تھی۔

☼ ☼ ☼

"محسن!" کنول نے ہونٹ بھینچے' گاڑی چلاتے محسن کے بازو کو ہلایا تو اس نے غصے میں کار کی اسپیڈ بڑھادی۔ کنول ڈر گئی۔ اور پریشان ہو کر شہر سے باہر نکلنے والے راستے کو دیکھنے لگی۔ یعنی محسن نے رات لاہور میں رکنے کا ارادہ ملتوی کردیا تھا۔ اور واپس فیصل آباد جارہا تھا۔ مگر اتنی رات کو جب کہ کنول خوب صورتی سے تیار بھی تھی اور اس نے سونے کے زیورات بھی پہنے ہوئے تھے۔ محسن اتنی افراتفری میں اسے لایا تھا کہ وہ اپنی چادر لینا بھول گئی تھی۔

"محسن! اتنی رات کو سفر کرنا ٹھیک نہیں ہے جو بھی بات ہے ہم آرام سے بھی کرسکتے ہیں' مگر اس طرح....." کنول نے محسن کو اندھا دھند گاڑی چلاتے دیکھ کر سمجھانا چاہا۔

"کیا بات کروگی تم؟ تم اپنا اعتبار کھو چکی ہو۔" محسن نے غصے سے اس کا موبائل جیب سے نکال کر اس کی گود میں پھینکا تھا۔ کنول نے نا سمجھی میں کانپتے ہاتھوں سے موبائل ہاتھ پر لیا۔ موبائل کی میسج ٹون بجی۔

"دیکھ لو تمہارے شیری صاحب کا ہی میسج ہوگا۔" محسن نے طنزیہ کہا تو کنول چونک گئی۔ اب اسے محسن کے غصے کی وجہ سمجھ آئی تھی۔ میسج شیری کا ہی تھا وہ پریشان تھا کہ "سب ٹھیک ہے؟ محسن اس طرح غصے میں کیوں چلا گیا؟" کنول نے کانپتے ہاتھوں سے میسج پڑھا۔

"محسن! میرے بات سنیں یہ سب.....!" کنول نے اپنے خشک ہوتے ہونٹوں پہ زبان پھیری تھی۔

"کیا سنوں؟ تم کیسے خود کو جسٹی فائی کروگی؟ میرے علم میں لائے بغیر' تم نے کسی نامحرم سے موبائل پہ دوستی رکھی ہوئی تھی؟ کیوں آخر؟ کون سی کمی دی تھی میں نے یا ایسے ظلم تم پہ کیے تھے کہ تم ایسے سہارے تلاش کرتی؟" محسن غصے سے چیخ رہا تھا۔ یہ سب اس کی برداشت اور سوچ سے آگے کا تھا۔ اس لیے وہ ضبط کھو رہا تھا۔ کنول جو آج سے پہلے اس بات کو معمولی سمجھتی رہی تھی آج اسے اپنی حرکت کی سنگینی کا احساس ہو رہا تھا۔ واقعی محسن کیا' کوئی اور بھی یہ موبائل چیٹ یا میسجز دیکھتا تو غلط ہی سمجھتا۔ کنول کے پاس دو راستے تھے یا تو وہ جھوٹ پہ جھوٹ بول کر اپنی غلطی کو چھپانے کی کوشش کرتی یا پھر اپنی غلطی کو تسلیم کرکے معافی مانگ لیتی۔ اسے دوسرا راستہ زیادہ بہتر لگا اور اس نے یہ ہی کیا۔

"محسن میں مانتی ہوں کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے' مگر خدا کی قسم میری نیت میں کوئی فتور نہیں تھا' میں پچھلے کچھ عرصے سے جس ذہنی اذیت اور تکلیف سے گزر رہی ہوں بس مجھے سمجھ ہی نہیں آئی کہ میں جانے' انجانے میں کسی گناہ کی مرتکب ہو رہی ہوں۔ آپ نے سب میسجز پڑھے ہیں اس میں کوئی بھی ایسی ویسی بات نہیں تھی' مگر جو بھی تھا میں نے غلطی کی اور میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ پلیز مجھے معاف کردیں' میں آپ سے بے وفائی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی پلیز محسن....." کنول نے بری طرح روتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ محسن نے غصے سے اسٹیئرنگ پہ ہاتھ مارا اور کار ایک جگہ روک دی۔ یہ دیکھے بغیر کہ یہ بالکل ویران اور سنسان جگہ تھی۔ کنول رو رہی تھی معافی مانگ رہی تھی۔ محسن کو کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ اسے اس بات کا شدید دکھ اور غصہ تھا کہ اس کی بیوی کسی سے رابطے میں رہی تھی۔ اس کی غیرت کے لیے یہ تازیانہ تھا۔ اس کا دل کررہا تھا سب کچھ فنا کردے روتی بلکتی کنول کو دیکھ کر اسے ملال بھی ہو رہا تھا' مگر کنول کی حرکت کے بارے میں سوچ کر

اس کا غصہ پھر سوا نیزے پہ پہنچ جاتا تھا۔ وہ دو انتہاؤں کے درمیان پنڈولم کی طرح جھول رہا تھا۔

"رونا بند کرو۔ گھر جا کر بات کریں گے۔" کچھ دیر بعد محسن نے خود پہ قابو پاتے ہوئے سرد لہجے میں کہا تو کنول خاموش ہو گئی۔ محسن نے کار اسٹارٹ کرنے کے لیے چابی گھمائی جب کسی نے اس کی طرف کا شیشہ ناک کیا۔ محسن نے سر گھما کر دیکھا تو چہرے پہ نقاب ڈالے پستول ہاتھ میں تھامے وہ اسے کار سے نیچے اترنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ اسی وقت کنول نے بھی چیخ ماری کیوں کہ اس کی طرف بھی پستول بردار آدمی کھڑا ہوا تھا۔ کنول نے ڈر کے محسن کا بازو دبوچ لیا تھا۔ محسن اگر گاڑی بھگانے کی کوشش کرتا تو وہ فائرنگ کر دیتے کیوں کہ وہ دونوں ہی نشانے پہ تھے۔ محسن نے کار کا شیشہ نیچے کیا۔

"محسن پلیز! ان سے لڑنا مت، جو کہتے ہیں انہیں دے دو۔" کنول نے بار بار التجا کی تھی۔ محسن نے سر ہلا دیا تھا۔

"کار سے نیچے اترو دونوں۔" ان میں سے ایک نے غرا کر کہا تھا۔ وہ دونوں کار سے نیچے اتر آئے۔ کنول محسن کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک نے آگے بڑھ کر محسن کا موبائل اور والٹ جیب سے نکال لیا۔

"اپنا زیور اتار کر انہیں دے دو۔" اس سے پہلے کہ وہ کنول کی طرف بڑھتے محسن نے کہا تو کنول سر ہلاتے خوف سے کانپتے ہاتھ میں پہنی انگوٹھیاں اتارنے لگی۔ اسی وقت ایک ڈاکو نے دوسرے سے کہا۔

"کیا خیال ہے؟" اس کی آنکھوں میں خباثت واضح تھی۔

"خیال تو زبردست ہے، مگر ہم بائیک پہ ہیں۔" دوسرے نے بھی کنول پہ نظریں مرکوز رکھیں ہوئی تھیں۔ محسن ان دونوں کی گفتگو سن کر چونک گیا۔ پھر یک دم ہی اس کا غصہ ابھر آیا۔

"اپنی بکواس بند کرو کمینوں۔ خبردار جو کسی نے میری بیوی پہ بری نظر ڈالی۔" محسن نے طیش سے کہا۔

"تیری تو.....!" ان میں سے ایک ڈاکو نے اسے غلیظ گالی دی اور غصے سے اس پر فائرنگ کر دی۔ کنول کی چیخیں رات کا سینہ چیر رہی تھیں۔

"جلدی کرو نکلو یہاں سے! پولیس چوکی یہاں سے دور نہیں ہے۔" اس کے دوسرے ساتھی نے روتی بلکتی محسن کو آوازیں دیتی، کنول کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تھا۔ محسن خون میں لت پت زمین پہ گرا ہوا تھا۔ کنول کی چیخنے، چلانے اور لاکھ مزاحمت کرنے کے باوجود وہ اسے گھسیٹتے ہوئے کار تک لے آئے، اپنی بائیک وہاں پہ ہی چھوڑ کر وہ کنول سمیت کار لے کر فرار ہو گئے۔ پیچھے زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا محسن اندھیری رات اور سنسان سڑک پہ اکیلا رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"عفان اچھا لڑکا ہے۔ میرے خیال سے تمہیں اس کے پروپوزل پہ غور ضرور کرنا چاہیے۔" قریبی عزیز کی شادی کے فنکشن میں عظمیٰ کو اکیلا کھڑا دیکھ کر وہ پاس آ کر بولا تھا۔ عفان عظمیٰ کا چچا زاد تھا۔ خوب صورتی سے تیار اپنے حسن کو دو آتشہ کیے، عظمیٰ نے ایک کٹیلی نظر اس پر ڈالی تھی جو سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن رہا تھا۔

"دنیا اچھے لوگوں سے بھری پڑی ہے اب سب اچھوں سے ہی محبت تو نہیں ہو جاتی۔" عظمیٰ نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے سامنے سجے اسٹیج کی طرف دیکھا تھا۔ جہاں مہندی کی رسم کے لیے دلہن کو لایا جا رہا تھا۔ عظمیٰ جو پہلے ہمیشہ اس سے شرمائی اور گھبرائی ہوئی رہتی تھی۔ آج اسے نظر انداز کیے بہت اعتماد سے بول رہی تھی۔ یہ بات اسے چبھی تھی۔

"اچھا تو بات تمہاری محبت کی ہے۔" اس نے طنزیہ پوچھا تھا۔

"محبت صرف آپ کی جاگیر تو نہیں ہے کہ صرف آپ ہی دعوے دار بنیں سب اپنی اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہیں۔" اس کے دل کو افسوس ہوا کچھ عرصے پہلے وہ بھی اسی حالت اور کیفیت سے گزر رہا تھا۔

"خود کو اذیت مت دو۔ تم نازک سی لڑکی محبت کے روگ' سوگ کیسے پالوگی۔ چھوڑ دو یہ راہ۔ اپنی زندگی کی طرف دیکھو۔" اس نے سمجھانا چاہا تو وہ گہری سانس لے کر بولی۔

"اس راہ سے کبھی کوئی واپس بھی پلٹا ہے؟ اپنے اختیار میں کب ہے یہ جمع تفریق' فائدہ نقصان' محبت کی ہے کوئی کاروبار یا سودا تو نہیں جو پہلے اتنے حساب کتاب رکھتی۔ یقین کریں اپنے بس میں ہوتا تو.... تب بھی اس محبت کی منکر نہ بنتی۔ محبت کی توہین کیسے منظور کرلوں۔ خیر آپ چھوڑیں ان سب باتوں کو۔ اپنی کامیاب محبت کا جشن منائیں۔" عظمی نے اپنی آنکھوں میں مچلتے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے رخ موڑ لیا تھا' مگر وہ دیکھ چکا تھا۔ سن چکا تھا اور سمجھ بھی چکا تھا کہ محبت میں سب ہی ضدی بچے کی طرح ہوتے ہیں جتنے ضدی اور اتنے ہی بے بس۔

☼ ☼ ☼

کنول پچھلی سیٹ پہ بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔

"ہم زیادہ دیر تک اس گاڑی میں سفر نہیں کرسکتے ہیں۔ یہ خطرے والی بات ہوگی۔" کار چلاتے ہوئے شخص نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے دوسرے ڈاکو سے کہا تھا جس نے محسن پہ فائرنگ کی تھی۔

"ہاں تو شہر کی حدود میں داخل ہونے سے پہلے یہ کار اور اس لڑکی سے جان چھڑالیں گے۔ گاڑی روک سائڈ پہ ہمیں پیچھے جاتا ہوں۔" اس نے ہوس زدہ نظروں سے پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا تھا۔ دوسرا اس کا مطلب سمجھ کر خباثت سے ہنسنے لگا تھا رات اپنے آخری پہر میں داخل ہوچکی تھی۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹے کا راج تھا اسی لیے وہ دونوں مطمئن تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ گاڑی روکتا۔ بیک مرر میں دیکھ کر وہ بری طرح چونکا۔

"باس! گڑبڑ ہے! لگتا ہے پولیس ہمارا پیچھا کررہی ہے۔" دوسرے نے بھی پیچھے گھوم کر دیکھا تھا۔

"گاڑی بھگا۔" اس نے چیخ کر کہا تھا' مگر تب تک پولیس وین ان کے قریب پہنچ چکی تھی اور انہیں رکنے کا اشارہ کرنے لگی' مگر بدحواسی میں ان لوگوں نے کار کی اسپیڈ بڑھادی جس کو دیکھتے ہوئے پولیس نے فائرنگ شروع کردی اور کچھ دیر اسی طرح گزری پھر پولیس کی فائرنگ سے ان کی کار کا ٹائر برسٹ ہوا اور کار ایک زور دار آواز کے ساتھ فٹ پاتھ سے ٹکرا کر رکی تھی۔ ڈرائیونگ کرنے والا کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا اور وہ بے ہوش ہوگیا جبکہ دوسرے ڈاکو کے بازو پہ گولی لگ چکی تھی۔

کنول جو اس دوران ہوش میں آچکی تھی خوف زدہ سی بیٹھی رہ گئی جب پولیس نے ان سب کو اپنی تحویل میں لے کر فیصل آباد کے تھانے پہنچادیا۔ اس وقت فجر کی اذان ہوئے کافی دیر ہوچکی تھی اور صبح کی روشنی پھیل رہی تھی۔ کنول ڈری سہمی سے تھانے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے بھی ڈاکوؤں کی ساتھی سمجھا جارہا تھا اور عجیب عجیب نظروں سے دیکھتے اس سے مختلف سوالات کیے جارہے تھے۔ کنول رو رو کر اپنے ساتھ بیتی جانے والی صورت حال بتارہی تھی جب کوئی پولیس اسٹیشن میں داخل ہوا اور سب اسے سلام کرنے لگے۔

"السلام علیکم سر! یہ خاتون بھی ان دونوں کے ساتھ ہی تھی جو خود کو مظلوم بتارہی ہے اور...." اسی وقت اپنی کیپ اتارتے اس کی نظر کنول پہ پڑی تو وہ چونک گیا۔

"آپ اور یہاں؟" کنول نے چونک کر اس کی طرف دیکھا جو پولیس یونیفارم میں ملبوس تھا' مگر وہ اسے پہچان نہیں پائی۔

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں میں اس دن شیری کے ساتھ تھا اسپتال میں جہاں آپ ملی تھیں انسپکٹر احمد علی نام ہے میرا۔" اس نے اپنا تعارف کروایا تو کنول کے دماغ میں جھماکا ہوا تھا اور اسے احمد علی سے ہوئی ملاقات یاد آگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"امی ڈاکٹر نے بہت احتیاط کرنے کو کہا ہے۔ آپ

نے کسی بھی طرح کی کوئی ٹینشن نہیں لینی ہے۔"
راحت بیگم کو انجائنا کا اٹیک ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے بہت احتیاط کرنے کو کہا تھا۔ پچھلے دو دن سے وہ ماں کے ساتھ اسپتال میں ہی تھا باقی سب بھی آجا رہے تھے' مگر وہ تو ماں کی پٹی سے لگ کر ہی بیٹھ گیا تھا۔ ماں کے کمزور اور زرد چہرے کو دیکھتے ہوئے اسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ اس نے اپنی محبت کرنے والی ماں کا دل دکھایا ہے۔ انہیں تکلیف پہنچائی ہے۔ اپنی مرضی کرکے بڑے دونوں بھائیوں نے والدین کی پسند کے مطابق شادی کی تھی دونوں کی بیویاں غیر خاندان سے تھیں اس کے لیے راحت بیگم نے بہت پہلے ہی عظمیٰ کو چن رکھا تھا اور زبانی کلامی یہ رشتہ بھی طے تھا' مگر سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی اس نے اپنی پسند اور مرضی سے شادی کی۔ حتیٰ کہ اپنے گھر والوں کی ناراضی کا بھی خیال نہیں کیا۔

"امی آپ مجھ سے ناراض ہیں؟" اس نے ماں کی خاموشی پہ بے چین ہو کر ان کا ہاتھ تھام کر پوچھا تھا۔ راحت بیگم نے مندی مندی آنکھوں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور بولیں۔

"نہیں!" اس ایک لفظ سے اس کی تسلی نہیں ہوئی تھی' مگر راحت بیگم آنکھیں بند کر چکی تھیں۔

"ہر والدین کی طرح ہم نے بھی تمہارے لیے وہ ہی سوچا جو بہتر لگا۔ والدین اولاد کا برا کب چاہتے ہیں' مگر جب اولاد ہی مان کو توڑ دے اس کی تکلیف اور اذیت کیا ہوتی ہے تم تب سمجھو گے جب خود باپ بنو گے۔"

راحت بیگم نے نقاہت زدہ لہجے میں کہا تھا۔ وہ بوجھل دل سے وہاں سے نکلا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ اپنے فیصلے پہ پچھتا رہا تھا' مگر والدین کی نافرمانی کرنے کا احساس آج شدید ہو رہا تھا۔ شاید ماں کو تکلیف میں دیکھ کر حالانکہ ان کی بیماری حکم ربی تھی' مگر اتنے مہینوں کے چھپائے گلٹ کو آج روزن مل گیا تھا۔ دعا نے دو دن بعد اس کی صورت دیکھی تھی۔ بڑھی شیو' پریشان حال' گم صم سا۔

"کھانا گرم کر رہی ہوں تب تک فریش ہو جائیں۔" دعا نے اسے دیکھ کر نرمی سے کہا۔ وہ سر ہلا کر کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد آیا تو دعا ڈائننگ میز پہ برتن رکھ رہی تھیں اس کے بیٹھتے ہی گرم گرم کھانا لے آئی۔ کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ کھانے کے بعد دعا چائے بنا کر کمرے میں آئی تو وہ چائے پیے بغیر بیڈ پہ لیٹا آنکھوں پہ بازو رکھے سو رہا تھا یا سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ دعا گہری سانس لے کر رہ گئی۔ دوسری طرف آکر اس کے پاس بیٹھی اور نرمی سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ جیسے اپنے ہونے کا احساس دلا رہی ہو۔

"میں جانتی ہوں کہ کسی اپنے' بہت پیارے کو کھونے کا ڈر کیا ہوتا ہے؟" دعا ایسے بول رہی تھی جیسے خود کلامی کر رہی ہو۔

"اور جب یہ ہی ڈر سچ ثابت ہو جائیں تو؟" اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر چہرے پہ پھیل رہے تھے۔

"آپ جانتے ہیں کہ بدگمانی' اس تیز آندھی کی طرح ہوتی ہے جو سب کچھ اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے دیکھنے والی سب آنکھوں میں مٹی ڈال دیتی ہے کہ پھر ہم کچھ دیکھنے کے قابل نہیں رہتے ہیں۔ بدگمان تو کسی غیر کے لیے بھی نہیں رکھنا چاہیے اور جہاں بات کسی بہت اپنے اور پیارے کی آجائے تو بھلے اس سے ناراض ہو جائیں' مگر بدگمان نہیں جیسے کہ آج آپ ہو رہے ہیں مجھ سے بدگمان۔" دعا کے چہرے سے پھسل کر آنسو اس کے چہرے پہ گرے تو وہ چونک کر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ دعا کے آنسو اسے تکلیف دے رہے تھے' مگر وہ حیران بھی تھا کہ دعا کیسے اس کے دل کی بات جان گئی تھی۔ وہ سچ میں دل ہی دل میں دعا سے بدگمان ہو رہا تھا جس نے ایک بار بھی اس کی ماں کی خیریت دریافت نہیں کی تھی بلکہ اس کے سامنے نارمل رویہ پیش کر رہی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔

"نہیں میں ناراض ضرور ہوا تھا' مگر بدگمان نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"ناراض ہوتے تو شکوہ ضرور کرتے اس طرح خاموشی سے چائے پیے بغیر آنکھوں پہ بازو رکھ کر نہ

لپیٹ جاتے جیسے مجھے دیکھنا ہی نہ چاہتے ہوں۔" دعا نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو وہ اس کی سمجھ داری کو سراہتا' سرہلا کر رہ گیا۔

"آپ پہلے ہی بہت پریشان اور تھکے ہوئے آئے تھے اور مجھے اندازہ تھا کہ آپ نے اسپتال میں پریشانی میں کچھ نہیں کھایا ہوگا اسی لیے میں چاہتی تھی کہ آپ فریش ہو کر سکون سے کھانا کھالیں۔ اس لیے آتے ہی کوئی سوال نہیں کیا تھا سامنے والی کی خاموشی کا مطلب اس کی بے حسی نہیں ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اپنوں کی بھلائی اور فکر کے خیال سے بھی یہ خاموشی اختیار کرنی پڑتی ہے۔" دعا نے نظریں جھکائے ہوئے کہا تو وہ بے اختیار مسکرادیا۔

"مجھے نہیں اندازہ تھا کہ مجھے ایسی سمجھ دار اور محبت کرنے والی بیوی ملی ہے۔" اس کے شرارتاً کہنے پہ دعا مسکرائی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اگر آپ کہتی ہیں تو میں لیڈی کانسٹیبل کے ساتھ آپ کو گھر بھجوا دیتا ہوں۔ میری شیری سے بات ہوئی ہے۔ وہ فیصل آباد کے لیے نکل چکا ہے چاہے تو اس کا انتظار کریں۔" احمد علی نے مسلسل روتی ہوئی کنول سے کہا۔ جس کی ذہنی حالت ابتر ہو رہی تھی۔ ایک رات میں ہی وہ کس قیامت سے گزری تھی۔

"میرے شوہر کے بارے میں کوئی اطلاع ہے' پتا نہیں وہ کس حال میں ہوں گے۔" کنول کی آنکھوں کے سامنے خون میں لت پت محسن بار بار آرہا تھا۔

"ہم انہیں ٹریس کرنے کی کوشش کر رہے ہیں بہت جلد کوئی خبر ملے گی۔ آپ حوصلہ رکھیں۔" احمد علی کے کہنے پہ کنول نے اثبات میں سرہلا دیا اور پھر احمد علی نے اسے پولیس وین میں گھر بھجوا دیا۔ اس کی حالت بہت مخدوش ہو رہی تھی۔ دوپٹا نجانے کہاں رہ گیا تھا۔ کھینچا تانی میں کپڑوں کا برا حال ہو چکا تھا۔ احمد علی نے آتے ہی اسے کہیں سے لے کر چادر مہیا کر دی تھی۔ جس میں خود کو لپیٹے جب وہ اپنے گھر پہنچی تو سارا محلہ اکٹھا ہو گیا تھا۔ ان کے ساتھ ہوئے حادثے کی اطلاع عافیہ آپی کے ذریعے پہلے محلے کے کچھ قریبی گھروں تک پہنچی تھی پھر جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی گئی تھی۔ دراصل محسن نے ہوش میں آتے ہی عافیہ آپی کو اطلاع کی تھی۔ محسن کو لاہور کے اسپتال لے جایا گیا تھا۔ اب کنول کو پولیس وین سے اتنے مخدوش حال میں اترتے دیکھ کر سب مختلف سوال کرنے کو بے چین تھے۔ گھر کی چابیاں اس کے پاس نہیں تھیں اسی لیے تالا توڑا گیا اور یوں کنول گھر کے اندر داخل ہوئی اور دروازہ بند کر کے وہاں ہی بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نجانے اسے کتنی دیر بیت گئی جب بیل بجی کنول بے حس و حرکت بیٹھی رہی' مگر دروازہ مسلسل بجنے لگا تو خود کو سنبھالتی اس نے دروازہ کھول دیا۔ شیری پریشان سا باہر کھڑا تھا۔

"کنول آپ ٹھیک تو ہیں۔" کنول کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ زیادہ دیر اس کے سامنے کھڑی رہتی۔ وہ فوراً" پلٹی تھی۔

"آپ خود کو سنبھالیں پلیز! محسن کا پتا چل گیا ہے۔ وہ لاہور کے اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔" شیری نے وہاں سے ہی اطلاع دی تھی۔ کنول فوراً" مڑ کر اس کے پاس آئی تھی۔

"پلیز مجھے محسن کے پاس لے چلو پلیز!" وہ منت کر رہی تھی۔ ہاتھ جوڑ رہی تھی۔

"کنول خود کو سنبھالیں آپ۔ میں آپ کو لاہور لے جاؤں گا' مگر پہلے آپ اپنا حلیہ درست کریں اس طرح جائیں گی تو..." شیری کے احساس دلانے پہ وہ شرمندہ ہو گئی۔

"میں ابھی آتی ہوں۔" کہہ کر اندر کمرے کی طرف بڑھ گئی جبکہ وہ اپنی کار میں جا کر بیٹھ گیا اور احمد علی سے فون پر بات کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ آئی تو اس کا حلیہ بہتر تھا۔ بڑی سی چادر میں خود کو چھپائے وہ نقاہت کی وجہ سے آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ شیری جانتا تھا کہ اسے آرام کی شدید ضرورت ہے' مگر وہ کبھی بھی نہیں مانے گی محسن کو دیکھے اور ملے بغیر اسے چین

نہیں آئے گا۔ اس کے اعصاب اتنے تھکے ہوئے تھے کہ اب نہ اس میں مزید رونے کی ہمت باقی رہی تھی اور نہ کچھ بولنے کی۔ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر اس نے آنکھیں بند کی تھیں اور تھوڑی دیر میں وہ سو چکی تھی۔ شیری نے آہستگی سے اس کی سیٹ کا لیور پریس کیا تاکہ وہ آرام سے سوتی رہی اور خاموشی سے کار چلاتا وہ مختلف سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔

احمد علی نے اسے حادثے کی ساری تفصیلات بتا دیں تھیں جو کنول نے پولیس کو بتائی تھیں۔ کنول کی حالت وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ اور یہ ہی بات اسے اذیت دے رہی تھی۔ محسن اتنے غصے میں وہاں سے کیوں نکلا تھا؟ یہ بات اسے ابھی تک سمجھ میں نہیں آئی تھی اور کنول کی ایسی حالت نہیں تھی کہ وہ کسی بارے میں بات کرسکے۔ اپنی ہی سوچوں میں غلطاں وہ لاہور کے مشہور سرکاری اسپتال پہنچے۔ جہاں محسن کو کل رات لایا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

راحت بیگم کی حالت بہت بہتر ہو چکی تھی۔ سب نے ان کا بہت خیال رکھا تھا۔ خاص کر عظمی نے بھی۔ ان کی خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی یہ سب کچھ دکھاوے کے لیے نہیں تھا وہ سچ میں ہی اپنی خالہ سے بہت اٹیچڈ تھی۔ راحت بیگم بھی اس سے بہت پیار کرتی تھیں۔ اسی لیے تو اسے اس گھر میں لانا چاہتی تھیں۔ بینا شام کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی کیوں کہ آج اس کا بھی واپسی کا ارادہ تھا۔ جب وہ وہاں پہ پہنچا۔

"چائے پیو گے؟" بینا باجی نے اسے آتے دیکھ کر پوچھا تو وہ نفی میں سر ہلا کر رہ گیا اور فریج میں سے پانی نکال کر وہاں ہی بیٹھ کر پانی لگا۔

"ابو مسجد گئے ہوئے ہیں؟" وہ ان کے خالی کمرے سے ہو کر آیا تھا۔

"ابو نے اور کہاں جانا ہوتا ہے۔ کبھی کبھار واک کرنے چلے جاتے ہیں۔ مسجد تو ماشاءاللہ باقاعدگی سے جاتے ہیں۔" بینا باجی نے مسالا بھونتے ہوئے کہا تھا۔

"امی کے پاس نہیں گئے؟" بینا باجی نے اسے خاموش دیکھ کر سوال کیا تھا۔

"گیا تھا ان کے پاس! وہ عظمی سے باتیں کر رہی تھیں۔ میں پانی پینے کچن میں آگیا۔" اس نے جواب دیا تھا۔

"عظمی نے بہت ساتھ دیا ہے اس مشکل وقت میں بغیر کسی صلے یا غرض کے! امی سے اور اس گھر سے محبت دیکھ کر ہم سوچتے تھے کہ ہماری والدین کو آخری عمر میں بہو کا سکھ اور ہمیں محبت کرنے والی بھابھی مل جائے گی، مگر جو رب کو منظور....!" بینا باجی نے افسردگی سے کہا تھا۔

"آپ لوگ اپنی ضد پہ اڑے ہوئے ہیں۔ دعا بھی رشتوں کو جوڑنے والی ہے۔" اس نے کہا تو بینا باجی اسے سرد نظروں سے دیکھتی بولی تھیں۔

"جس لڑکی نے تمہیں ہم سب سے دور کر دیا۔ تم اسے رشتے جوڑنے والی کہہ رہے ہو اس کی یہ خوبی صرف تم تک ہی محدود ہے میرے بھائی!" بینا باجی نے طنزیہ لہجے میں کہا تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔

"تم جاؤ یہاں سے مجھے امی سے بات کرنی ہے۔" اس نے اپنا غصہ عظمی پہ نکالا تھا جو اس کے لہجے اور لفظوں پہ شاکڈ رہ گئی اور آنکھوں میں ڈھیروں آنسو بھر کر بھاگتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

"یہ کس لہجے میں بات کی ہے تم نے اس سے! تمہاری خادمہ نہیں ہے وہ۔" راحت بیگم نے غصے میں کہا تو وہ سر جھٹک کر رہ گیا جیسے ماں سے بحث کرنے کا ارادہ نہ ہو۔

"میں دعا کو آپ سے ملوانا چاہتا ہوں۔" اس نے وہ بات کہہ دی جو پہلے نہیں سوچی تھی۔

"ہاں ضرور! میرے مرنے پہ لے آنا۔" راحت بیگم نے اطمینان سے کہا تو وہ تڑپ کر رہ گیا۔

"آخر کیوں امی! اس میں کیا برائی ہے جو آپ اسے اتنا ناپسند کرتی ہیں؟" اس نے جھنجلا کر پوچھا تھا۔

''اس میں لاکھ خوبیاں ہوں گی، مگر میرے لیے اس کی ہر خوبی بھی خامی ہی رہے گی۔ عظمیٰ کے سامنے وہ مجھے کبھی بھی نہیں اچھی لگ سکتی ہے۔'' راحت بیگم نے اٹل لہجے میں کہا تھا۔

''امی مان لیں عظمیٰ نہیں ہے سامنے'' آپ لا رہی ہیں اسے...'' وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔

''میرے لیے صرف وہ ہی ہے سامنے تمہاری تم جانو۔'' راحت بیگم نے منہ پھیر لیا تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر جانے لگا جب پیچھے سے ماں کی آواز سنی تھی۔

''تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے شیریار!'' اس نے پلٹ کر ماں کے چہرے کی طرف دیکھا تھا جس پہ لکھا رنج واضح تھا اور شکستہ قدموں سے وہاں سے چلا آیا تھا۔ رات دیر تک سڑکوں پہ بے مقصد گاڑی گھمانے کے باوجود وہ اپنی ذہنی حالت سے چھٹکارا نہیں پاسکا تھا۔ آج اسے سمجھ آیا تھا کہ ایک محبت کے لیے اتنی ساری محبتوں کو چھوڑنا اور اپنی جنت بنانا آسان نہیں تھا۔ آج بے کلی اتنی بڑھی تھی کہ محبت کا احساس اور خیال بھی دل کو تسلی نہیں دے رہا تھا۔ اسی اندھیرے میں امید کی ایک کرن نے راہ دکھائی تھی۔ اور وہ ایک نئی امید کا سرا تھامے اپنی بنائی جنت کی طرف لوٹا تھا جہاں اس کے آنے کی منتظر دعا کب سے دریچے سے لگی کھڑی تھی۔

آسمان پہ بکھرے ستاروں میں اپنے مقدر کا ستارہ ڈھونڈ رہی تھی جو باوجود کوشش کے اسے کبھی نہیں ملا تھا!

☆ ☆ ☆

محسن کی خوش قسمتی تھی کہ گولی اس کے بازو کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ ہڈی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ مگر اتنی دیر نیم بے ہوشی کی حالت میں سڑک پہ گرے رہنے کی وجہ سے خون کافی ضائع ہو چکا تھا۔ کسی نے ترس کھا کر اسے قریبی سرکاری ہسپتال پہنچا دیا تھا مگر خود پولیس کیس کے ڈر سے بغیر شناخت کروائے چلا گیا تھا۔ اس ہسپتال میں علاج معالجے کی مناسب سہولیات نہ ہونے کی وجہ سے اسے

ایمبولینس کے ذریعے لاہور لایا گیا۔ جہاں فوری ٹریٹمنٹ کے بعد جب اسے تھوڑا سا بھی ہوش آیا تو اس نے اپنے گھر اطلاع پہنچائی تھی۔ عافیہ آپی اپنے شوہر خاور کے ساتھ روتی پیٹتی وہاں پہنچیں تو ڈاکٹر نے محسن کی حالت خطرے سے باہر بتائی مگر اسے آئی سی یو میں انڈر آبزرویشن رکھا گیا تھا۔ عافیہ آپی اپنے دونوں بچے گھر میں اپنی ساس اور چھوٹی نند عاصمہ کی زیر نگرانی چھوڑ کر آئی تھیں۔ محسن نے ہوش میں آتے ساری تفصیل انہیں بتا دی تھی۔ پولیس بھی بیان لینے آئی تھی۔ کنول کہاں تھی اور کس حال میں تھی۔ محسن کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی۔ وہ بار بار ہوش میں آ کر کنول کے بارے میں پوچھتا تھا۔ پھر دوپہر تک اطلاع ملی کہ دونوں ڈاکو پکڑے گئے ہیں اور کنول کو برآمد کر لیا گیا ہے۔ محسن پٹیوں میں جکڑا' بار بار عافیہ آپی کو فیصل آباد جانے کو کہہ رہا تھا۔

''پلیز آپی کنول کے پاس چلی جائیں پتا نہیں وہ کس حال میں ہو گی۔''

محسن کو وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ جب اس نے پاس بیٹھی بہن سے منت کی تھی۔ جن کا چہرہ کنول کے نام پہ سپاٹ ہو چکا تھا۔

''میں اپنے بھائی کو اس حال میں چھوڑ کر اس ڈائن کے پاس نہیں جا سکتی جو ہمارے گھر کی خوشیاں کھا گئی ہے۔ منحوس لڑکی جس دن سے بیاہ کر لائے ہیں صرف پریشانی اور تکلیفیں ہی دیکھی ہیں اور تم بھی ذرا ہوش سے کام لو۔ مت بھولو کہ وہ ساری رات ان ڈاکوؤں کے قبضے میں رہی ہے' کون جانے کیا ہوا اور کیا نہیں' ہم دنیا کو کیا منہ دکھائیں گے۔''

عافیہ آپی پھٹ پڑی تھیں۔ محسن زرد چہرہ لیے چپ ہو گیا۔ خاور یہاں موجود نہیں تھے۔ ڈاکٹر سے رپورٹس لینے گئے تھے۔

''آپی ایسے مت کہیں' کنول....''

اسی وقت اس کی نظر کالی چادر میں لپٹی۔ تیز تیز قدم اٹھاتی کنول پہ پڑی تھی۔ خوشی کی لہر اس میں دوڑی۔ اس سے پہلے کہ وہ کنول کو پکارتا' دوسری نظر اس کے

پیچھے آتے شیری پہ پڑی تو اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔ اسے سب یاد آنے لگا تھا۔ اس شخص کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا اور یہ اسی کے ساتھ......"
محسن نے غصے سے سوچا تھا۔
"محسن! آپ ٹھیک تو ہیں؟" کنول محسن کے پاس آ کر بے اختیار رو پڑی تھی۔
"میں ابھی آرام کرنا چاہتا ہوں۔ آپی پلیز مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔"
محسن نے سرد مہری سے کہہ کر آنکھیں موند لی تھیں۔ کنول شاکڈ رہ گئی تھی محسن نے ایک بار بھی اس کی حالت کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔
"چلو یہاں سے!" عافیہ آپی نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے محسن کو دیکھتی وہ وارڈ سے باہر نکل آئی۔ شیری پہلے ہی باہر کھڑا تھا۔ وہ محسن کا سرد مہر رویہ دیکھ چکا تھا۔ اسی وقت دو پولیس والے وہاں آ گئے۔
"آپ کا اغوا ہوا تھا؟ ہمیں آپ کا بیان ریکارڈ کرنا ہے۔ اس طرف آجائیں۔"
پولیس والوں کے کہنے پہ کنول خاموشی سے ان کے پیچھے چل پڑی جبکہ عافیہ آپی نے حقارت سے منہ پھیر لیا تھا۔ شیری البتہ اس کے ساتھ ہی تھا۔
"آپ کا نام؟" پولیس والے نے پیپر پین پکڑتے ہوئے پوچھا تھا۔
"کنول....." گم صم اسی حالت میں اس نے بتایا۔
"پورا نام کیا ہے بی بی!" پولیس والے نے پھر پوچھا تو وہ چونکی۔
"دعا کنول.....!" اس کے لب ہلے تھے۔ کچھ دور کھڑے شیری نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ جو اپنا بیان لکھوا رہی تھی۔ اس نے موبائل میں وقت دیکھا۔ ولیمہ کی تقریب شروع ہو چکی تھی۔ گھر سے آنے والے فون بار بار اس کی خیریت دریافت کر رہے تھے اور وہ "میں آ رہا ہوں کچھ دیر میں" کہہ کر ٹال رہا تھا۔ وہ اسے اس حالت میں اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ وہ لاکھ سب سے چھپاتا مگر یہ اس کا دل جانتا تھا کہ وہ اس کی محبت میں کتنا آگے نکل چکا تھا۔ جو آج تک اس سے اور اس کی محبت سے انجان رہی تھی۔ مگر شہریار کا دل تو محبت میں گزرے پل پل سے واقف تھا۔ نجانے وہ کونسی قوت یا کشش تھی جو اسے دعا کے گرد دیوانہ وار چکر لگانے پہ مجبور کرتی تھی اور ان لمحوں میں وہ کیسے اپنے آپ پہ قابو پاتا تھا یہ وہ جانتا تھا یا اس کا رب!

☆ ☆ ☆

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہما اور دعا کنول بی اے میں زیر تعلیم تھیں دونوں کی دوستی کالج کے پہلے سال ہوئی تھی۔ اور گزرتے وقت کے ساتھ مضبوط ہوتی گئی تھی۔ ہما بہت زندہ دل اور شوخ لڑکی تھی جبکہ اس کے برعکس دعا کنول بہت شرمیلی اور کم گو سی لڑکی تھی۔ جبکہ شہریار عرف شیری بی کام فائنل ایئر کا طالب علم تھا۔ ہما کی زیادہ دوستی شہریار سے تھی۔ جو اکثر اسے لینے یا چھوڑنے کالج بھی آتا تھا اور اکثر و بیشتر اسے دعا کے گھر بھی لے کر جاتا تھا۔ یا جب دعا کنول ان کے گھر آتی تو واپسی پہ ہما کے ساتھ اسے چھوڑنے جاتا تھا۔ دعا اپنی شادی شدہ بہن شمائلہ کے ساتھ رہتی تھی۔ جس کے دو بچے تھے۔ جن میں دعا کی جان تھی۔ شمائلہ کا شوہر حمزہ امریکا میں سیٹل ہونے کے لیے دن رات محنت کر رہا تھا۔ اور بہت جلد اس کا ارادہ اپنی فیملی کو بلانے کا بھی تھا۔ اسی لیے اس نے شمائلہ پہ زور دیا تھا کہ بی اے کرتے ہی دعا کی شادی کر دو تاکہ اس کے فرض کو ادا کر کے وہ امریکا آسکے۔
حمزہ دعا کے لیے فکر مند تھا۔ شمائلہ کو اس بات کی خوشی بھی تھی اور اطمینان بھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ شمائلہ جتنی خوب صورت تھی اس کے برعکس دعا کنول مناسب شکل و صورت کی مالک تھی۔ اس لیے اس کے رشتوں کی لائن نہیں لگی ہوئی تھی۔ مگر پھر بھی شمائلہ دن رات اسی مقصد کی تکمیل میں لگی ہوئی تھی۔ فی الحال دعا ان سب معاملوں سے دور تھی۔ اس کی زندگی کالج، گھر، آپی کے دونوں کیوٹ بچے اور ہما تک ہی محدود تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کوئی بہت

آہستہ آہستہ اس کی سادگی اور معصومیت کا اسیر ہوتا جا رہا ہے؟

یہ سچ تھا کہ شہریار کو دعا سے محبت پہلی نظر میں نہیں ہوئی تھی۔ جیسے جیسے وہ اسے جانتا گیا' اس کی شخصیت کے وصف اس پہ کھلتے گئے وہ اس کا اسیر بنتا گیا۔ مگر ابھی وہ خود بھی ہاں اور نہ کے درمیان کھڑا تھا۔ بی اے کے بعد دونوں نے ایک ساتھ ہی یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ شیری بھی اسی یونیورسٹی میں تھا مگر ان سے سینئر اور اس کا ڈیپارٹمنٹ الگ تھا۔ یہ وقت اور روز کا ملنا شیری کی محبت کو گہرا کرتا گیا۔

مگر دعا کنول کے فائنل ایئر میں اس کی منگنی ہو چکی تھی جو کچھ مہینوں پہ ہی محیط رہی۔ ان دنوں شیری نے نئی نئی جاب شروع کی تھی۔ جب اچانک ہی اس پہ بم پھٹا کہ دعا کی شادی ہو رہی ہے۔ وہ اپنی لاعلمی پہ خود کو کوستا رہ گیا اور دعا کنول ہنستی مسکراتی کسی اور کے سنگ رخصت بھی ہو گئی۔ شہریار کی خاموش محبت اس کے دل میں کراہتی' بین کرتی رہ گئی۔ دعا کو سب گھر والے پسند کرتے تھے۔ راحت بیگم بھی اکثر اس کی عادتوں کی تعریف کرتی تھیں۔ شہریار جانتا تھا کہ راحت بیگم نے عظمیٰ کو اس کے لیے پسند کر رکھا ہے۔ مگر اسے یقین تھا کہ وہ ماں کو راضی کر ہی لے گا۔ مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ دعا کی شادی کے بعد شمائلہ بھی امریکا چلی گئی۔ ہما کا رابطہ بھی اس سے نہیں رہا اور اسی جدائی اور وقت نے اسے بتایا کہ دعا اس کے لیے کتنی اہم تھی۔ وہ اس کی محبت میں کتنی ہی منزلیں خاموشی سے طے کر گیا تھا۔

حمزہ کو کسی ضروری کام کی وجہ سے پاکستان آنا پڑا تو وہ فیملی کو بھی لے آیا۔ تب دعا کنول لاہور ملنے آئی اور اتفاقاً" ہی اس کی ملاقات ہما سے شاپنگ پلازہ میں ہوئی اور شیری نے جب اسے اتنے دنوں کے بعد دیکھا تو کچھ دیر کے لیے گم صم ہی رہ گیا۔

اس ملاقات کے بعد اس کی بے چینی اور تشنگی بڑھ گئی تھی۔ مگر دعا کو خوش دیکھ کر وہ صبر کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کے کچھ مہینوں کے بعد ہما کی شادی کی تاریخ مقرر ہوئی اور جب کارڈ چھپے تو پہلا کارڈ ہما نے شیری کے ذریعے دعا کے گھر بھجوایا تھا۔ اور پہلی بار اس کے گھر جا کر اور محسن سے مل کر شیری کو اطمینان ہوا کہ دعا اپنے گھر میں آباد و شاد ہے۔ اس دوران دعا کے موبائل پہ وہ اکثر مختلف بہانوں سے **میسجز** کرنے لگا۔ کبھی ہما کا بہانہ بنا کر' کبھی شادی کی تیاریوں کا ذکر کر کے' کبھی کوئی اچھا سا **میسجز** شیئر کر کے وہ آہستہ آہستہ دعا کی دوستی کے دائرے میں آتا رہا۔ دراصل یہ شہریار کا شعوری عمل تھا جو اسے اپنی محبت کے آس پاس رہنے پر مجبور کرنے لگا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس دوستی کو پروان چڑھانے لگا۔ وہ رک بھی جاتا اگر دعا کنول کا رسپانس نہ ملتا۔ دعا کنول جو پہلے محتاط انداز میں **میسجز** کرتی تھی بعد میں وہ بھی دلچسپی دکھانے لگی تھی۔ دراصل یہ دعا کنول کی زندگی کا بھی وہ فیز تھا جب وہ ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب اور پریشان رہتی تھی۔ اور اپنے اندر کی گھٹن اور حبس سے چھٹکارا پانے کے لیے اسے یہ چھوٹا سا روزن ملا تھا۔ نفس سے لڑنے کو افضل جہاد اسی لیے کہا گیا ہے؟ خود سے لڑنا اس وقت جب آپ پہلے ہی اندر سے توڑ پھوڑ کا شکار ہوں، بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے انسان کو برے گمان رکھنے اور مایوس ہونے سے منع فرمایا گیا ہے۔

کشتی میں ہوا چھوٹا سا سوراخ بھی اسے ڈبونے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ ابتدا ہمیشہ چھوٹے عمل سے ہی ہوتی ہے اور یہ چھوٹی چھوٹی کنکریاں بہت قیامت ڈھاتی ہیں۔ شہریار نے اسی دوران جانا کہ دعا ذہنی طور پر بہت پریشان ہے۔ اسے یہ یقین ہونے لگا کہ دعا جو بظاہر محسن کے ساتھ خوش نظر آتی ہے دراصل خوش نہیں تھی۔ مگر اپنا بھرم رکھے ہوئے تھی۔ ورنہ اور کیا وجہ ہو سکتی تھی اس کے ناخوش رہنے اور مایوس ہونے کی۔

وہ اپنی سوچوں میں حقیقت کے سب رنگ خود ہی بھرنے لگا۔ اس نے دل ہی دل میں عہد کر لیا تھا کہ اگر دعا کو کبھی سہارے کی ضرورت پڑی تو وہ پیچھے نہیں ہٹے گا۔

اس دوران ہما کی شادی ملتوی بھی ہوئی اور کچھ عرصے کے بعد پھر تاریخ رکھی گئی اور ان ہی دنوں شہریار کا ٹرانسفر لاہور ہو گیا تھا۔ اسے دعا کے نرم رویے سے لگنے لگا تھا کہ جیسے وہ بھی اس میں دلچسپی لے رہی ہو مگر ابھی واضح کچھ نہیں ہوا تھا اور ہما کی شادی کا دن آگیا۔ شہریار نے محسن کے ساتھ سجی سنوری ہنستی مسکراتی دعا کو آتے ہوئے دیکھا تو اس کا یقین ڈگمگانے لگا تھا۔ پھر محسن کا غصے سے وہاں سے جانا اور اس حادثے کا ہونا اس کے بعد کے سب بدلتی اور تلخ رویے اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔

اسے دعا کی سچائی کا یقین تھا مگر اور کسی کو بھی نہیں! جب تک محسن ہسپتال میں ایڈمٹ رہا۔ شہریار روز جاتا رہا۔ پھر ان کے جانے کے بعد کچھ مہینے تک شہریار کا دعا سے کوئی رابطہ نہیں رہا۔ دعا کا نمبر مسلسل بند ملتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دعا مشکل میں ہے مگر وہ اب اس کے گھر نہیں جا سکتا تھا۔ کیونکہ ہسپتال میں ہی محسن اور عافیہ آپی کا سرد رویہ اور چبھتی نظریں وہ دیکھ چکا تھا۔ وہ ان دنوں شدید پریشان رہتا تھا اور ان دوڑتے بھاگتے روز و شب میں اسے وہ خبر ملی۔ جس نے کچھ دیر کے لیے ہی سہی اسے ساکت کر دیا تھا۔

"محسن نے دعا کو طلاق دے دی تھی!"

☆ ☆ ☆

شمائلہ' دعا کے اغوا کا سن کر پاکستان پہنچی تھی۔ اپنے شوہر اور دو بڑے بچوں کو چھوڑ کر تیسرے نمبر والے بچے کو لے کر جو ابھی چھوٹا تھا اور ماں کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کا ارادہ مہینہ رہ کر جانے کا تھا۔ مگر جب وہ یہاں آئی تو چکرا کر رہ گئی۔ دعا کی زندگی بری طرح الجھی ہوئی تھی۔ دعا کے پاس بہن کے علاوہ کوئی اور قریبی رشتہ نہیں تھا اس لیے اس نے اسے ہی آواز دی تھی۔ شمائلہ اسے اس طرح بیچ میں چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔ اس نے بہت کوشش کی کہ دعا کے مسئلے حل ہو جائیں اور وہ اپنے گھر میں آباد رہے مگر سب بے سود رہا اور دعا ماتھے پہ طلاق کا داغ سجائے واپس لوٹ آئی۔ یہ شمائلہ کے لیے دھچکا تھا۔ بہت مشکل سے پہلے ہی دعا کی شادی کی تھی اب پھر اس کی ذمہ داری' شمائلہ کے سر آپڑی تھی اور اس پہ دعا نے اول سے لے کر آخر تک سب کچھ شمائلہ کو بتا دیا تھا۔ شمائلہ جو پہلے ہی جھنجلائی ہوئی تھی غصے سے پھٹ پڑی تھی۔

"تم کوئی دودھ پیتی بچی تھیں جسے یہ نہیں پتا تھا کہ اس طرح کی موبائل دوستی کا انجام کیا ہوتا ہے؟ بھلے تم شہریار سے واقف تھی مگر کیا تم محسن کے مزاج اور اپنی حدود کو نہیں جانتی تھی۔ تم نے خود اپنی عزت محسن کی نظروں میں کم کی تھی اور اوپر سے تمہارا اغوا!"

شمائلہ نے دعا کو جو ڈانٹا وہ الگ بات تھی۔ مگر جب شہریار دعا کی طلاق کا سن کر آیا تو شمائلہ نے اسے بھی بے نقط سنائی تھی۔ اور سارا الزام اس کے سر ڈال دیا کہ نہ وہ دعا کی زندگی میں دخل اندازی کرتا' نہ محسن وہ میسجز پڑھتا اور نہ اتنی رات کو غصے میں سفر کرتا جس کی وجہ سے ان دونوں کو اتنی بڑی تکلیف سے گزرنا پڑا تھا۔ شہریار یہ سن کر شاکڈ رہ گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ محسن کے غصے کی وجہ اس کے میسجز بنے تھے۔ مگر دعا کی عدت ختم ہوتے ہی وہ وہاں پہنچا تھا۔ دعا نے اس سے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ مگر شہریار کے بار بار جانے اور بضد رہنے پہ "مجبوراً" اسے ملنا پڑا۔ شہریار نے وقت ضائع کیے بغیر اسے پرپوز کر دیا اور ساتھ ہی اپنی محبت کا بھی اظہار کیا۔ جس پہ دعا بھڑک گئی تھی۔ اس نے شہریار پہ اپنے دل کا سب غبار اور فرسٹریشن نکالی تھی۔ اور شمائلہ کی طرح اسے ہی مورد الزام ٹھہرانے لگی وہ سب کچھ قبول کر کے تلافی کرنا چاہتا تھا۔

دعا بھی کسی طور پہ راضی نہیں تھی۔ وہ جس تکلیف اور صدمے سے گزری تھی اس کے لیے سب بے معنی ہو کر رہ گیا تھا' مگر شمائلہ اب کوئی فیصلہ چاہتی تھی۔ وہ زیادہ عرصے تک پاکستان نہیں رک سکتی تھی۔ حمزہ اور بچوں کا اصرار بڑھ رہا تھا کہ جلد واپس آئے۔ تبھی اس نے دعا سے دوٹوک بات کی تھی کہ اسے شہریار کے حق میں فیصلہ کر لینا چاہیے کیونکہ اس سے بہتر رشتہ اسے دوبارہ نہیں ملے گا۔ دوسری

صورت میں وہ اپنے لیے خود سوچ لے کہ آگے کیا کرنا ہے؟ شمائلہ کے اکھڑے اور بے زار رویے نے دعا کو غفلت کی نیند سے جگا دیا تھا اور اسے اپنے لیے سوچنے پہ مجبور کر دیا تھا اور اس سوچ کی ابتدا جہاں سے بھی ہوئی مگر اس کا اختتام شہریار پہ ہی ہوا تھا۔ اور جب آخری بار شکستہ حال شہریار اس کے سامنے اپنا کشکول پھیلائے آیا تو دعا نے ہاں سکے کے اس کی طرف اچھال دیے تھے شہریار حیرت اور خوشی سے گنگ رہ گیا۔ وہ محبت کے محاذ پہ جیت گیا تھا، مگر رشتوں کے محاذ پہ بری طرح ہارا تھا۔ جبکہ دعا اپنا آخری رشتہ بھی ہار کر خالی دل و دماغ لیے شہریار کے سنگ خاموشی سے رخصت ہوئی تھی۔ وہ خاموشی اتنی گہری تھی کہ دعا کے دل نے بے اختیار سوچا تھا۔

"اتنی خاموشی سے تو کوئی کسی مرنے والے کو بھی نہیں دفناتا ہے۔"

مگر یہ خاموشی اور سرد مہری شمائلہ گھر سے نکلنے تک تھی۔ شہریار نے اپنی زندگی اور اپنی بنائی چھوٹی سی جنت میں اس کا استقبال اتنی خوب صورتی سے کیا کہ دعا کے اندر سکون پھیلنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

دونوں اپنی اپنی جگہ سوچوں میں گم پارک میں چکر لگا رہے تھے۔ ہفتہ وار چھٹی ہونے کی وجہ سے پارک میں رش تھا۔ دعا جب چلتے چلتے تھک گئی تو ایک پرسکون گوشے میں موجود بینچ پہ بیٹھ گئی۔ شہریار نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"میں تھک گئی ہوں، آپ راؤنڈ مکمل کر کے آجائیں۔"

دعا نے پھولی سانسوں کے ساتھ کہا شہریار اس کے پاس آکر بینچ پہ بیٹھ گیا۔

"تم ساتھ چل رہی تھیں تو خاموشی بھی باتیں کر رہی تھی اور چلنا بھی اچھا لگ رہا تھا۔ اب بیٹھ کر خاموشی کو سنتے ہیں۔"

شہریار نے شرارتاً کہا تو دعا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اب وہ اکثر اس طرح خوشی سے بھرپور ہنسی ہنس دیتی تھی۔ شہریار کی باتوں میں سحر تھا جو اسے اسیر کرنے لگا تھا۔ دعا نے سر گھما کر کچھ دور ہنستے کھیلتے، دوڑتے بھاگتے بچوں کو دیکھا۔ شہریار نے بھی اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تھا۔

"تمہیں بچے بہت اچھے لگتے ہیں نا! اسی لیے تم شمائلہ آپی کے بچوں سے بے حد پیار کرتی تھیں۔ ان کے ساتھ بچہ بنا پھرتی تھیں۔ میں ہما کے ساتھ جب کبھی بھی تمہارے گھر آتا، تمہیں ان کے ساتھ ہی مگن دیکھتا تھا۔"

شہریار نے ماضی کا ورق پلٹا تو دعا کی آنکھوں میں نمی پھیلنے لگی تھی۔ اسے شدت سے ان سب کی یاد آئی تھی۔

"دعا! تم جانتی ہو بچوں کے پیار اور شرارتوں میں ایسی طاقت ہوتی ہے۔ جو پتھر دلوں کو بھی موم بنا دیتی ہے۔ میرے گھر والے مجھ سے بہت ناراض ہیں۔ وہ میرے اس فیصلے کو قبول نہیں کر رہے ہیں جبکہ......!"

دعا نے سر گھما کر شہریار کے طرف دیکھا جو سامنے کی طرف دیکھ کر بات کر رہا تھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ اس گھر میں تمہاری مستحکم حیثیت کو قبول کیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ جب ہمارے بچے ہوں گے تو وہ ضرور اپنی جگہ ان کے دلوں میں بنالیں گے۔ کہتے ہیں ناں کہ اصل سے سود پیارا ہوتا ہے۔ امی، ابو کو دونوں بھابیوں کے برے رویے کے باوجود ان کے بچوں سے بے حد پیار ہے اور......!"

شہریار اپنی دھن میں کہے جا رہا تھا۔

"ہمارے بچے؟ اور اگر نہ ہوئے تو......!"

دعا نے سوالیہ انداز میں پوچھا تو شہریار یکدم چپ کر گیا۔

"یہ کیسی بات کر رہی ہو تم! اچھا سوچو یار!" شہریار نے سر جھٹک کر کہا۔

"یہ ناممکن بات تو نہیں ہے؟ کیا آپ اپنے اور میرے رشتے کو اس سے مشروط کر رہے ہیں؟" دعا نے دھڑکتے دل سے سوال کیا تھا۔

"نہیں محبت مشروط نہیں ہوتی کسی چیز سے بھی! میں نے یہ رشتہ اسی محبت کی بنیاد پہ بنایا ہے۔ مگر میں صرف عمومی رویے اور سوچ کی بات کر رہا تھا۔ مجھے یقین ہے امی کا دل ضرور نرم پڑ جائے گا۔"

شہریار نے امید بھرے انداز پہ کہا تو دعا چپ کی چپ رہ گئی۔ جبکہ شہریار اسی جوش سے بول رہا تھا۔

"میڈیکل رپورٹس کے مطابق میرے ماں بننے کے چانسز بہت کم ہیں کوئی دعا یا معجزہ ہی ایسا ممکن بنا سکتا ہے!"

دعا کے منہ سے نکلے لفظوں پہ شہریار نے حیرت اور بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ دعا کا چہرہ سپاٹ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ آج نہیں تو کل شہریار یہ سچ جان ہی لے گا۔ اسی لیے اس نے بتادینا ضروری سمجھا تھا۔

اب کی بار شہریار چپ کا چپ رہ گیا تھا۔ کل رات جو امید کی کرن اسے نظر آئی تھی وہ بجھ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ہیپی ویڈنگ اینورسری!"

ہنستی مسکراتی دعا نے شہریار کی سائڈ ٹیبل پہ پھول رکھتے ہوئے کہا تھا۔ شہریار جو ابھی بے دار ہی ہوا تھا دھیرے سے مسکرا دیا اور کہنی کے بل اٹھ کر پھولوں کو دیکھتا ان کی نرم پتیوں کو چھونے لگا۔

"پانچ سال ہو گئے ہیں آج!" شہریار نے کچھ سوچتے ہوئے حساب لگایا تھا۔ تو دعا نے اثبات میں سر ہلایا۔

"آپ تیار ہو جائیں میں ناشتا بنانے جا رہی ہوں۔"

دعا نے نرمی سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

"شام کو تیار رہنا میں آفس سے جلدی گھر آجاؤں گا۔ پہلے تمہارے من پسند گفٹ لیں گے اور پھر اچھا سا ڈنر کریں گے۔ اور ہاں آج آئس کریم بھی کھائیں گے۔ کوئی ڈائٹنگ نہیں کوئی پابندی نہیں!"

شہریار نے ناشتا کرتے ہوئے پلان ترتیب دیا تو دعا نے سر ہلا دیا تھا اور اس کے جانے کے بعد لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی۔ اور غور سے ہر چیز کو دیکھنے لگی۔ ہر چیز بہت اچھی اور اپنی جگہ پہ فٹ لگ رہی تھی۔ سارا گھر ان دونوں نے مل کر سجایا تھا۔ ایک دوسرے کی پسند سے۔ اس گھر کے ہر کونے میں بے شمار خوب صورت پل آج بھی زندہ تھے، سانس لیتے تھے۔ سچ میں یہ گھر ان دونوں کی چھوٹی سی دنیا، چھوٹی سی جنت تھی مگر!

دعا گھٹنوں میں سر رکھ کر بے اختیار رونے لگی تھی۔ یہ جنت ادھوری تھی نامکمل تھی۔ نہ کسی اپنے کا ساتھ تھا اور نہ بچوں کی قلقاریاں تھیں جامد خاموشی جو اکثر اب ان دونوں کے رشتے پہ بھی طاری رہنے لگی تھی! وہ آج بھی ڈاکٹرز سے علاج کروا رہی تھی۔ ان کی دی ہوئی سب ہدایتوں پہ اس سے زیادہ، سختی سے عمل شہریار کرواتا تھا۔ ڈاکٹرز کے مطابق وزن کنٹرول میں رکھنا تھا اسی وجہ سے شہریار نے ہر طرح کی چیزیں گھر میں لانی چھوڑ دی تھیں۔ پہلے اکثر دونوں ہوٹلنگ کرنے، پزا کھانے یا آئس کریم کھانے چلے جاتے تھے۔ مگر اب ایسا نہیں ہوتا تھا۔

شہریار نے امید نہیں چھوڑی تھی۔ وہ دعا کا ساتھ دے رہا تھا۔ مگر دن بہ دن خاموش اور سنجیدہ ہوتا جا رہا تھا اور یہ تب سے ہوا تھا جب تین سال پہلے اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ تب سے شہریار بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ چھٹی کا سارا دن وہ ماں کے پاس گزارتا تھا اور ویسے بھی اکثر چلا جاتا تھا۔ کیونکہ وہ بہت تنہا اور اکیلی ہو گئی تھیں۔ دعا کا وقت زیادہ تر اسی کے انتظار میں گزرنے لگا تھا۔ شمائلہ سے کبھی کبھار نیٹ کے ذریعے سرسری بات چیت ہو جاتی تھی مگر دعا صحیح معنوں میں تنہا اور اکیلی اب ہوئی تھی۔ نہ سسرال کا پیار اور آسرا تھا اور نہ میکے کا مان! شہریار جو پہلے اس سے باتیں کرتا نہیں تھکتا تھا اب ساتھ ہوتا بھی تو لیپ ٹاپ پہ مصروف رہتا یا ٹی وی دیکھتا رہتا۔ دونوں کے پاس معمول کی چند باتوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہوتا تھا ایک دوسرے کو کہنے کے لیے، شہریار اس کے ساتھ اپنے فرینڈز کی فیملی پارٹیز میں نہیں جاتا تھا کیونکہ ان دونوں میں قد اور جسامت کا فرق بہت واضح ہونے لگا تھا۔ دعا کی جسمانی ساخت فربہی مائل تھی اور وہ اپنی عمر

سے کچھ بڑی لگتی تھی۔ جبکہ شہریار کا معاملہ برعکس تھا۔ وہ دعا کو ہیل نہیں پہننے دیتا تھا کہ اس طرح وہ مزید لمبی لگتی تھی۔ پھر لوگوں کے سوال گھر والے مانے یا نہیں؟ بچے کیوں نہیں وغیرہ سے شہریار چڑنے لگا تھا۔ اس لیے اس نے ایسی جگہوں پہ جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ لوگوں کی زبانیں نہیں روک سکتا تھا۔ لوگ محبت' ہمدردی اور احساس کی آڑ میں بہت کچھ سنا جاتے تھے۔

دعا اس خاموشی اور ویرانی سے تھکنے لگی تھی مگر اس کے اختیار میں کچھ نہیں تھا اور اس کا ٹوٹنا' تنہائی' اکیلا پن اسے اپنے رب کے مزید قریب کرتا جا رہا تھا۔ جو اپنے بندوں کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے جو توڑ کر خود سے جوڑ دیتا ہے۔ بس ذرا صبر اور ہمت سے کام لینا پڑتا ہے۔ نفس کے گورکھ دھندے سے نکلنا اور لڑنا آسان نہیں ہوتا ہے اور آزمائش میں یہ نفس سرکش بھی زیادہ ہو جاتا ہے! مایوسی' ناامیدی اچھائی برائی کا فرق مٹانے لگتے ہیں مگر اب کی بار دعا نے اپنے رب کو امید سے نہیں بلکہ یقین سے پکارا تھا اور اس کا دل گواہی دینے لگا تھا کہ اندھیرا چھٹنے کو ہے۔ اس نے پہلے کی طرح اپنی قسمت اور لکھے ہوئے دردو تکلیف سے بھاگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بلکہ اسی درد میں اپنے رب کی رضا ڈھونڈنے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆
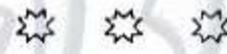
''تم جس اولاد کی تمنا اور خواہش میں اتنی تکلیف اٹھا رہی ہو جانتی ہو جب بڑا ہو کر وہ ہی بچہ اپنی من مانی کرے اور والدین کے مان کو توڑ کر چلا جائے! اس کی تکلیف اور اذیت کا اندازہ کر سکتی ہو؟''

دعا ڈاکٹر کے کلینک میں ویٹنگ روم میں بیٹھی تھی جب کوئی اس کے پاس آکر ساتھ والی سیٹ پہ بیٹھا اور دھیرے سے بولا تھا۔

''ہما! تم۔۔۔!'' دعا نے اسے دیکھا تو بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ ہما نے تھکی ہوئی نظر اس پہ ڈالی تھی۔ اس کی گود میں چند ماہ کا بچہ بھی تھا۔

''میں نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا ہے۔'' دعا کنول نے تڑپ کر کہا تھا۔

''مگر ہمارے ساتھ برا کیا ضرور ہے تم نے۔''

ہما نے جواب دیا تو دعا لب کچل کر رہ گئی۔

''کنول' میں آج تم سے لڑنے یا شکوہ کرنے نہیں آئی ہوں اور نہ کسی بحث میں پڑنے' مگر تم مانو یا نہ مانو تمہاری وجہ سے ہم سب کی زندگی رک سی گئی ہے۔ ابو کی وفات کے بعد تو جیسے سب کو چپ سی لگ گئی ہے۔ امی خاموشی سے درودیوار دیکھتی رہتی ہیں' تم جانتی ہو کہ امی کو شہریار سے کتنی محبت تھی اور وہ کتنے سالوں سے اس کی خوشیاں دیکھنے کی منتظر' عظمیٰ آج بھی اس کا روگ لیے جی رہی ہے۔ امی کو عظمیٰ کے بے رنگ رہنے کا دکھ اور شہریار کی بے حسی کی بہت تکلیف ہے۔ اسی لیے وہ مزید بیمار ہوتی جا رہی ہیں۔ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو!''

ہما نے آبدیدہ لہجے میں کہا تو دعا دہل کر رہ گئی۔ دعا پہلے ہی شہریار کی سنجیدگی اور خاموشی کو جھیل رہی تھی۔ اگر ماں کو کچھ ہو گیا تو شہریار شاید ہنسنا بولنا ہی بھول جائے گا۔

''میں شہریار کو جانتی ہوں۔ وہ تم سے کیے وعدے پہ قائم ہے اور جب تک تم اسے نہیں کہو گی' تب تک وہ اسی طرح اندر ہی اندر احساس ندامت کی آگ میں جلتا رہے گا۔''

ہما نے کہا تو دعا نے سر جھکا لیا کیونکہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

''امی نے اسے معاف کر دیا ہے اور تمہیں بھی بہو کے طور پر قبول کرنے پہ راضی ہیں مگر صرف ان کی یہ شرط یا خواہش سمجھ لو کہ وہ چاہتی ہیں کہ شہریار عظمیٰ سے دوسری شادی کر لے۔ شہریار نے کوئی جواب نہیں دیا ہے مگر اس کی خاموشی چیخ چیخ کر اعلان کر رہی ہے کہ وہ ماں کی بات اب کی بار رد نہیں کرنا چاہتا ہے مگر مجبور ہے تمہاری وجہ سے۔''

ہما کے کیے انکشاف نے دعا کو گنگ کر دیا تھا۔ اسی لیے شہریار پچھلے کئی دنوں سے گم صم سا رہنے لگا تھا۔

''فیصلہ اب تمہیں کرنا ہے دعا!'' ہما نے آہستگی

سے کہا اور وہاں سے اٹھ کر چلی گئی تھی۔ دعا گم صم سی اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼ ☼

چٹکی چاندنی میں خاموش، گم صم سی وہ کب سے ٹیرس میں کھڑی ہوئی تھی جب شہریار اسے پکارتا ہوا آیا۔

"کیا ہوا دعا؟ ایسے کیوں اکیلی، گم صم سی کھڑی ہوئی ہو؟" شہریار نے پریشانی سے پوچھا تو دعا نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ شہریار کے دل کو کچھ ہوا۔

"دعا!" اس کے لب ہلے تھے۔ سب کے لیے وہ کنول تھی مگر اس کے لیے دعا تھی۔ اسی لیے وہ شروع سے یہ ہی نام پکارتا تھا۔

"آج سے کئی سال پہلے اماوس کی رات میں، جب روشنی کی کوئی کرن نہیں تھی ایک فیصلہ میں نے کیا تھا۔ کسی کے فیصلہ سنانے سے پہلے۔۔۔"

دعا نے رخ موڑ کر سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ شہریار نے الجھ کر اسے دیکھا تھا۔

"کیسا فیصلہ؟"

"محسن کو چھوڑنے کا فیصلہ۔" دعا نے کہا تو شہریار شاکڈ سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

"محسن نے تمہیں خود چھوڑا تھا یا اس نے تمہیں طلاق دی تھی۔" شہریار کے لب حیرت سے ہلے تھے۔

"اس نے مجھے نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے اسے چھوڑنے کا فیصلہ سنا کر طلاق کا مطالبہ کیا تھا۔"

دعا نے اعتراف کیا تو شہریار حیرت سے اسے دیکھتا نفی میں سر ہلانے لگا تھا۔ جیسے اسے یقین نہ آرہا ہو۔ جبکہ دعا دل میں پھیلتے درد کو لیے، اسی گھر میں ٹھہری رات میں پہنچ گئی، جہاں اس کی تقدیر نے پانسا پلٹا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس ہوئے ہولناک حادثے کے بعد سے دعا کی زندگی یکسر بدل گئی تھی۔ وہ سب کے لیے ایک چٹ پٹی خبر بن چکی تھی۔ محلے دار، آس پاس کے لوگ اس کے بارے میں عجیب عجیب باتیں کرنے لگے تھے۔ محلے کی عورتیں ہمدردی سے بہانے بہانے سے اس سے ایسے ایسے سوال کرتیں کہ دعا کا دل چاہتا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ گھر سے باہر نکلتی تو سب سر سے لے کر پاؤں تک اسے گھورتے، اوباش لڑکے اس کی طرف دیکھ کر اشارہ کرتے اور قہقہہ لگا کر ہنستے! اس کی عزت محفوظ رہی تھی اس کا یقین کسی کو بھی نہیں تھا۔ اس بات پہ سب استہزائیہ انداز میں ہنس پڑتے۔ یہ تو باہر کی صورت حال تھی۔ گھر میں اس سے بھی برا ماحول ہو چکا تھا۔ عافیہ آپی ہر روز آجاتی تھیں اور بستر پہ لیٹے بیمار محسن کے آگے واویلا مچاتیں، شور کرتی تھیں کہ بدنامی کی اس پوٹ کو گھر سے نکالو۔ دعا سے نفرت کا اظہار کرتیں اور محسن چپ رہتا۔ محسن نے اسے بلانا اسے دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ عجیب سی سوچوں میں گم رہتا تھا۔

جب تک اس کا زخم بھرا گھر کا یہ ہی ماحول رہا۔ مگر جب محسن نے گھر سے باہر جانا شروع کیا تو صحیح معنوں میں قیامت اس وقت مچی۔ جب پہلے دن وہ لال بھبھوکا چہرہ لیے گھر میں داخل ہوا اور غصے میں ادھر سے ادھر چکر لگاتا، چیزیں پھینکنے لگا۔ نجانے وہ کس کا غصہ، کس پہ نکال رہا تھا۔ دعا کنول دبک کر بیٹھی رہی۔ اس کی غیرت پہ کیسے کیسے تازیانے پڑ رہے تھے، دعا کنول کو اندازہ تھا۔ پہلے وہ عافیہ آپی کی باتوں اور رو واویلا کو معمولی سمجھ رہا تھا مگر جب خود بھی باہر کی دنیا کا سامنا کرنا پڑا تو اسے سمجھ آئی کہ عافیہ آپی کا رونا پیٹنا غلط نہیں تھا۔ پھر یہ روز کا تماشا بن گیا۔ محسن کا مزاج کڑوے کریلے کی طرح ہو گیا۔ دعا اپنے ہی گھر میں چوروں کی طرح رہنے لگی تھی۔ یہ اعصاب شکن جنگ ایسے ہی کچھ مہینے چلتی رہی پھر ایک دن عافیہ آپی اپنے دونوں بچوں سمیت سامان باندھ کر چلی آئیں اور محسن کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔

"محسن تم نے آج تک اپنی پسند اور مرضی کی ہے۔ یہ سوچے بنا کہ تمہاری وجہ سے مجھے کتنا سہنا اور برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ اس حادثے کے بعد سے

میرے سسرال والوں نے مختلف سوال کر کے میرا جینا دو بھر کر دیا ہے۔ ہنستے ہیں مجھ پہ' باتیں کرتے ہیں۔ عجیب وغریب سوال کرتے ہیں اسی لیے میں سب کچھ چھوڑ کر چلی آئی ہوں اب اور برداشت نہیں ہوتا ہے۔"

محسن نے سرخ ہوتی آنکھوں کے ساتھ بہن کا سر تھپکا تھا پھر دو' تین دن دونوں بہن بھائی کمرہ بند کر کے میٹنگ کرتے رہتے۔ جیسے کسی فیصلہ پہ پہنچنا چاہ رہے ہوں۔ دعا بھی اس صورت حال سے تنگ آچکی تھی۔ قصور وار نہ ہوتے ہوئے بھی اسے سزا دی جا رہی تھی۔ وہ بھی اندر ہی اندر خود کو مضبوط کرتی کسی فیصلے پہ پہنچ رہی تھی۔ پھر وہ گھڑی آہی پہنچی۔ دعا سیاہ کالی رات میں جب آسمان پہ کوئی تارہ' دور دور تک نظر نہیں آرہا تھا۔ خاموشی سے صحن میں کھڑی تھی۔ جب محسن اس کے پاس آیا۔ کافی دیر چپ رہنے کے بعد بولا۔

"کنول!" کتنے عرصے بعد دعا کنول نے اپنا نام اس کے منہ سے سنا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی پھیلنے لگی تھی۔

"میں نے ایک فیصلہ کرلیا ہے۔" محسن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تو دعا نے بھی اسی سنجیدگی سے کہا تھا۔

"ایک فیصلہ میں نے بھی کرلیا ہے مگر پہلے آپ کا سننا چاہوں گی۔" دعا کے کہنے پہ محسن چونکا پھر دوبارہ گویا ہوا۔

"میں نے ہمیشہ تمہارا ساتھ دیا ہے۔ حتیٰ کہ تمہاری کمی اور بیماری کے باوجود' تمہیں مکمل سپورٹ کیا' تمہاری اس میسجز والی غلطی تک کو اگنور کرنے کے لیے دل کو سمجھاتا رہا۔ پھر وہ حادثہ۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے جھوٹ نہیں بول رہی مگر میں تھک گیا ہوں لوگوں سے لڑتے' ان کو سنتے ہوئے۔ لوگ اس حادثے کو لے کر عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں سوال اٹھاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وقت کے ساتھ سب نارمل بھی ہو جائے مگر اب مجھ میں مزید حوصلہ نہیں ہے خود سے لڑنے کا۔ اسی لیے میں عافیہ آپی کی بات مانتے ہوئے بہت جلد دوسری شادی کر رہا ہوں۔ میں اپنی محبت کرنے والی بہن کو مزید دکھ نہیں دے سکتا ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں تمہیں بھی نہیں چھوڑوں گا۔ مگر تمہیں کچھ عرصے کے لیے منظر عام سے ہٹنا ہو گا۔ تاکہ اس واقعے پہ وقت کی گرد پڑ جائے۔"

محسن نے عافیہ آپی سے طے کیا ہوا لائحہ عمل اسے بتایا تو دعا کنول نے گہری سانس لی اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں آپ کے فیصلے کی قدر کرتی ہوں کہ اتنا کچھ ہونے کے باوجود آپ نے میرا سوچا' مگر۔۔۔" دعا نے کچھ لمحوں کا توقف کیا۔ محسن نے ابرو اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"میں بھی مزید آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتی ہوں۔ میں نے اپنی خطاؤں اور ناکردہ جرم کی سزا پالی ہے۔ مزید کا حوصلہ مجھ میں نہیں ہے۔ آپ کے حوصلے اور ظرف کو آزمانے سے بہتر ہے کہ میں ہمیشہ کے لیے آپ کی زندگی سے چلی جاؤں! مجھے طلاق چاہیے محسن۔۔۔!"

دعا کنول کے چہرے پہ آنسوؤں بہہ رہے تھے اور آخری لائن کہتے ہوئے اس کے لب کپکپائے تھے۔ محسن نے حیرت اور بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ جو رخ موڑ کر کھڑی ہو چکی تھی۔ اسے لگا تھا کہ دعا کنول روئے گی' چلائے گی' منتیں کرے گی کہ مجھے کبھی مت چھوڑنا! مگر دعا کے فیصلے نے اسے دھچکا پہنچایا تھا۔ کافی دیر چپ رہنے کے بعد' وہ یہ کہتے ہوئے پلٹ گیا۔

"جیسے تمہاری مرضی!" اس کی جان خود چھٹ رہی تھی دعا سے تو وہ مزید کیا کہتا۔ اس کے جاتے ہی دعا وہی بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ یہ فیصلہ کرتے وقت وہ پل صراط پہ سے گزری تھی۔ مگر وہ سمجھ چکی تھی کہ سامنے والے کا ظرف اور حوصلہ اس کے لیے ختم ہو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆
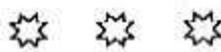
شہریار حیرت سے اسے سن رہا تھا۔ جس کے چہرے

پہ آنسوؤں کی لکیریں واضح تھیں۔
"اور میں آج تک یہ ہی سمجھتا رہا کہ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا۔ تمہاری بربادی میں میرا ہاتھ ہے۔ اومائی گاڈ!"
شہریار نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیری تھیں۔
"محسن کے کچھ بھی بتانے سے پہلے عافیہ آپی آپ کو میری مدد کرتے اور روز ہسپتال کے چکر لگاتے دیکھ کر بہت کچھ سمجھ گئی تھیں۔ باقی تفصیل محسن نے انہیں دے دی تھیں۔ آپ کا طعنہ اور حوالہ بھی میرے لیے تھا مگر اس حادثے کا نام پہلے لیا جاتا تھا۔" دعا نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔
"شمائلہ آپی کو مجھ سے پہلا اختلاف یہ ہی ہوا تھا کہ میں محسن سے علیحدگی کا فیصلہ بدل لوں۔ میں چاہے محسن کے گھر میں جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزارتی' انہیں اس سے غرض نہیں تھی بس وہ خوفزدہ تھیں کہ میری ذمہ داری مستقل ان کے سر نہ پڑ جائے۔ مجھے محسن کے رویے یا انداز میں بہتری کی ایک پرسینٹ بھی امید ہوتی تو شاید میں اپنا فیصلہ بدل بھی لیتی۔ مگر میں کوئی بہت صابر' یا عظیم عورت نہیں ہوں جو اپنے اوپر ہوئے ہر ظلم پہ عظمت کے مینار قائم کرتی رہتی۔ میں بہت معمولی برداشت اور صبر رکھنے والی عام سی عورت ہوں۔ جسے دکھ بھی ہوتا ہے' تکلیف بھی!
میں کیسے محسن کے ساتھ ایسی زندگی گزار لیتی جس میں میرے لیے' سوائے' نفرت' ذلت یا حقارت کے کچھ نہ ہوتا۔ محسن کی یہ اچھائی تھی کہ وہ فالتو سامان یا بوجھ کی طرح ہی سہی مگر مجھے گھر کے ایک کونے میں پھینکنا چاہ رہے تھے۔ مگر میں کوئی چیز نہیں تھی۔ جیتا جاگتا انسان ہوں میں نے اس گھر میں' محسن کے دل میں راج کیا میں کیسے وہاں نظروں سے گر کر' زندگی گزار لیتی۔ صرف سانس لینا ہی تو زندگی نہیں کہلاتا ہے! اس لیے میں نے محسن کو اس بوجھ اٹھانے کی زحمت اور مشقت سے آزاد کر دیا۔ نفرت سے ساتھ رہنے سے بہتر تھا کہ محبت سے جدا ہو جاتے اور آج پھر وہ ہی دوراہا ہے' وہی فیصلہ کرنا ہے۔"

دعا نے اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"کیا مطلب ہے تمہارا۔ کیسا فیصلہ؟ کیسا دوراہا؟"
شہریار نے چونکتے ہوئے پوچھا تھا۔
"شہریار!" دعا نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھاما اور اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولی۔
"میں دل سے آپ کی' آپ کی محبت کی قدر کرتی ہوں۔ یہ بھی سچ ہے کہ آپ نے اپنا کہا' پوری ایمانداری سے نبھایا ہے' مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہے مگر آج وقت کا تقاضا اور ہے۔ آج میں آپ کو ہر عہد' ہر وعدے کی پاسداری سے آزاد کرتی ہوں میں نہیں چاہتی کہ آپ اندر ہی اندر گھلتے رہیں' احساس ندامت کا شکار رہیں۔ یہ اندر کی جنگ' اندر کی ہار بہت تکلیف دیتی ہے۔ زندگی کی خوشیوں پہ آپ کا بھی حق ہے اور آپ کے اپنوں کا بھی۔" شہریار نے حیرت سے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ سرہلاتی مسکرا دی۔
"اس انا' ضد کی لڑائی کو ختم کر دیں اور اپنوں کو گلے سے لگالیں' اپنی امی کی بات مان لیں۔ پہلے ہی میری وجہ سے آپ نے بہت دل دکھایا ہے۔ جس کے لیے میں بہت شرمندہ ہوں۔"
دعا کی آنکھوں سے آنسو نکل کر شہریار کے ہاتھ پہ گر رہے تھے۔
"ایسے مت کہو دعا! میں خود ذمہ دار ہوں اس سب کا۔" شہریار نے آج تھک کر اعتراف کیا تھا۔
"بہت زندگی گزر گئی ہے سود و زیاں کا حساب کرتے' خسارہ جمع کرتے' چلو اب محبت کو تقسیم کر کے دیکھتے ہیں۔"
دعا نے نرمی سے کہا تھا۔ شہریار کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے جھلملا اٹھی تھیں۔ آنکھیں بھلے جدا جدا تھیں مگر آنکھوں میں جھلملانے والے آنسو ایک دوسرے کے لیے تھے ایک دوسرے کی محبت اور خوشی کے لیے تھے۔ اس سے مکمل بھی کچھ اور ہوتا ہے محبت کے جہاں میں!

☼ ☼ ☼

"نماز پڑھ لی تم نے؟" راحت بیگم نے اسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر نرمی سے پوچھا تھا۔

"جی امی! شہریار اور بچے قریبی مارکیٹ تک گئے ہیں۔ میں نے سوچا ابھی فری ٹائم ہے آپ کے ناخن کاٹ دوں۔"

دوپٹا نماز کے انداز میں لپیٹے وہ مصروف سے انداز میں بولی تھی۔ آج جمعہ تھا اور راحت بیگم باقاعدگی سے ناخن ضرور کٹواتی تھیں۔ ناخن کٹنے کے ساتھ ساتھ دونوں ہلکی پھلکی باتیں بھی کر رہی تھیں۔ جب حسب عادت شور مچاتے وہ تینوں اندر داخل ہوئے تھے۔ شہریار بچوں کے ساتھ بچہ ہی بن جاتا تھا۔

"بڑی ماما یہ دیکھیں میں آپ کے لیے کیا لایا ہوں۔"

پانچ سال کے گول مٹول سے عادل نے دعا کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا تھا۔ عادل اور عباد جڑواں تھے۔ ان سے دو سال چھوٹی حریم تھی۔ تینوں بچے دعا سے بہت اٹیچڈ تھے۔ دعا نے اس کی پھیلی ہتھیلی پہ دیکھا اس کی پسندیدہ چاکلیٹ تھی۔

"تھینک یو عادل!" دعا نے اس کا گال چوما تھا اس دوران وہ ہاتھ دھو کر آچکی تھی۔ اور اب دونوں بچوں سے باتیں کر رہی تھی۔ "اور عباد میرے لیے کیا لایا ہے؟"

دعا نے چاکلیٹ کھاتے عباد سے پوچھا تو وہ جھٹ سے بولا۔

"آپ کے لیے میں ہوں ناں!"

راحت بیگم اور دعا اس کی چالاکی پہ ہنس پڑیں۔ مگر شہریار نے ماں کی نظر بچا کر دعا کو آنکھ ماری تھی اور آہستگی سے بولا تھا۔

"یہ مجھ پہ گیا ہے!" دعا نے مصنوعی خفگی سے اسے گھورا مگر اس کے چہرے پہ حیا آمیز مسکراہٹ در آئی تھی۔ اتوار کو راحت بیگم کے ساتھ عادل اور عباد بھی واپس چلے گئے۔ مگر اگلے ویک اینڈ پہ پھر آنے کا وعدہ کر کے! دعا نے مسکراتے ہوئے سب کو رخصت کیا تھا اور کل صبح ذہنی بحالی کے سینٹر جانے کی تیاری کرنے لگی جہاں وہ پچھلے چار سالوں سے رضاکارانہ طور پر کچھ وقت گزارتی تھی۔ گزرتے وقت نے ثابت کیا تھا کہ کئی سال پہلے کیا ہوا اس کا فیصلہ کتنا درست ثابت ہوا تھا۔ شہریار کی عظمیٰ کے ساتھ شادی روایتی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ ماں بہنوں نے اپنے سب ارمان پورے کیے تھے۔ شادی سے پہلے راحت بیگم سے ملنے دعا گئی تھی۔ راحت بیگم نے اس کا استقبال خاموشی سے کیا تھا۔ مگر جب دعا نے ان کے ہاتھ پکڑ کر نم دیدہ لہجے میں کہا تھا۔

"مجھے یہ سوچ کر معاف کر دیجیے گا کہ میں دنیا میں وقت اور حالات کا شکار، اکیلی اور تنہا عورت ہوں۔ جس کے سر پہ آپ جیسی دعا کرنے والی ماں کا سایہ بھی نہیں ہے۔"

راحت بیگم پہلے ہی بیماری اور گزرتی عمر کے ساتھ کمزور ہو چکی تھیں۔ انہوں نے شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا تھا۔ اس دن دعا کو اپنی قربانی اور صبر کے بدلے اس کا جائز حق اور مقام مل گیا تھا۔

عظمیٰ جس نے اتنے سال اپنی محبت کا جوگ پالا تھا۔ اس کے لیے شہریار کا ملنا ہی خوش قسمتی تھا۔ وہ اس کی محبت میں اتنی ڈوبی ہوئی تھی کہ اسے کچھ اور سوچنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ دعا کو وہ پہلے ہی شہریار کی زندگی کا حصہ مان چکی تھی۔ جو تکلیف اٹھانی تھی وہ اس نے اس وقت اٹھائی تھی جب شہریار نے اسے چھوڑ کر دعا سے شادی کی تھی۔ اب جبکہ وہ ملن کی آس کھونے لگی تھی اسے محبت کا وصل نصیب ہوا تو وہ ساری دنیا سے بے گانی اسی میں خوش رہنے لگی تھی۔ ان کی زندگی کو مکمل کرنے کے لیے تین خوب صورت بچے بھی تھے۔ شہریار نے مستقل مزاجی اور صبر کے ساتھ دعا کو اس کا جائز مقام دلایا تھا۔ اب سب اس کی اہمیت اور مقام کو جانتے تھے۔

شہریار کی پہلی بیوی وہ ہی تھی۔ راحت بیگم، دعا کے اصرار کرنے پہ اس کے گھر پہلے ملنے جاتی تھیں پھر بھی

کبھار رہنے بھی لگی تھیں۔ دعا کی عادات اچھی تھیں یہ وہ پہلے بھی مانتی تھیں مگر جتنی عزت ' احترام اور پیار دعا نے انہیں دیا تھا وہ ان کے لیے حیران کن تھا شہریار تینوں بچوں کو بھی ملوانے لاتا رہتا تھا۔ عظمیٰ سے دعا کا ملنا کم کم ہی ہوتا تھا مگر جب بھی ملیں ' اچھے طریقے سے ملی تھیں۔ اب اکثر ہما بھی دعا کی طرف چکر لگا لیتی تھی۔

دعا نے محبت کو تقسیم کیا تو بدلے میں اسے بہت سی محبتیں ملی تھیں۔ اسے مضبوط زمین ملی تھی۔ رشتوں کا مان اور پیار ملا تھا۔ اس نے گزرتے وقت کے ساتھ جانا تھا کہ محبت کو پائیدار کرنا ہے تو محبت کو نفی نہیں ' بلکہ سب میں بانٹنا پڑتا ہے۔ صرف دو لوگ اپنی بنیادوں سے الگ ہو کر محبت کا جہاں آباد نہیں کر سکتے ہیں۔ جیسے کہ شہریار گزرتے وقت کے ساتھ مزید اس کا دیوانہ ہوا تھا۔ وہ دل سے دعا کا احسان مند تھا۔ اگر دعا اسے پیچھے سے پش نہ کرتی تو وہ ساری زندگی گومگو کی کیفیت میں کھڑا گزار دیتا۔ آج اگر اس کی زندگی مکمل تھی تو اس کی وجہ صرف اور صرف دعا کنول تھی! وہ اس کی زندگی میں دعا کی طرح ہی تھی مکمل اور پرسکون کر دینے والی۔ اپنا بنا لینے والی۔

☼ ☼ ☼

دعا نے ذہنی بحالی کے سنٹر میں کام کرتیں مختلف خواتین کی طرف دیکھا۔ اس ادارے میں ذہنی و جسمانی معذور خواتین کو ان کی ذہنی استعداد کے مطابق ہنر سکھایا جاتا تھا۔ دعا نے اپنے وقت کو دو چیزوں میں بانٹ دیا تھا۔ ایک علم سیکھنا اور دوسرا علم کو بانٹنا!

وہ صبح کے وقت قرآن و حدیث کی کلاس لیتی تھی۔ پھر اس سنٹر میں دوپہر تک وقت گزارتی تھی۔ اس کے بعد کا وقت اس کا اپنے گھر کے لیے ہوتا تھا۔ جس کو سجانے ' سنوارنے اور شہریار کا انتظار کرنے میں گزر جاتا تھا۔ دعا اپنی قسمت پہ راضی ہونا سیکھ گئی تھی۔ زندگی صرف سب کچھ پانے کا حاصل کرنے کا نام نہیں ہے! زندگی میں دینے کی عادت بھی ڈالنی چاہیے۔ ذہنی معذور کے ادارے میں وقت گزار کر اسے اندازہ ہوتا

تھا کہ اولاد کا ہونا بھی آزمائش ہے اور نہ ہونا بھی۔ جن کے بچے پیدائشی ذہنی معذور تھے ان والدین کی اذیت کو سمجھنا آسان نہیں تھا۔ زندگی میں صرف اپنی محرومی پہ رونا ' یا چلانا ہی سب کچھ نہیں تھا۔ زندگی کو بامقصد گزارنا اصل بات تھی۔

دعا نے اپنے دکھ ' اپنے درد کو رب کی رضا سمجھ کر قبول کیا تھا۔ اسے رب کی حکمت اور مصلحت پہ کوئی شک نہیں رہا تھا۔ اس نے درد میں اپنی بقا ' اپنی حیات ڈھونڈ لی تھی! کبھی کبھی شہریار بہت حیران ہوتا تھا اور کہتا تھا۔

"دعا تم بہت بہادر اور صبر والی ہو۔" دعا نفی میں سر ہلا کر کہتی تھی۔

"میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میں بہت عام سی عورت ہوں جو صرف اپنی حیات کے راستے آسان کر رہی ہے۔ جو رشتوں کی اہمیت کو جانتی ہے اور انہیں کو نبھانے کی کوشش کرتی ہے۔"

"تم نہیں سمجھو گی کبھی بھی کہ تم میرے لیے کتنی خاص ہو۔ میرا لمحہ سکوں ' حصہ جاں ہو!"

شہریار جذب کے عالم میں کہتا تو اس کے کندھے پہ سر رکھ کر دعا آنکھیں موند لیتی اور دھیرے سے کہتی!

"آپ بھی کبھی نہیں سمجھیں گے کہ بعض درد زندگی کی نوید ہوتے ہیں۔ ان کے بطن سے نئی زندگی جنم لیتی ہے۔ جو ابدی اور پائیدار ہوتی ہے اور میرے لیے وہ زندگی میرے رب کی رضا میں راضی رہنا ہے اور یہ بھی ممکن نہ ہوتا اگر آپ کا ساتھ نہ ملتا۔ جس نے درد سے لڑنا نہیں ' اس میں جینا سکھایا ' محبت کو تقسیم کرنا سکھایا ہے!"

دونوں ایک دوسرے کی محبت زمین میں پہ سفر کرتے ہوئے آسمان کے چمکتے اور ابدی ستارے بن رہے تھے اور یہ ہی اصل محبت کی معراج ہے۔

☼ ☼

سے رکھنی ہی پڑی۔ وہ دوسری عورتوں کے برعکس جو شوہر اور بچوں کے آفس و اسکول روانہ ہو جانے کے بعد دوبارہ سو جاتی تھیں ' پھرتی سے اپنے دن بھر کے کام نمٹا لیتی تھی اور شام کو فریش ہو کر ثوبان اور بچوں کو ٹائم دیا کرتی تھی۔

☼ ☼ ☼

ایمان نے بائیک روکی اور سامان کے بھرے ہوئے شاپر زاٹھا کر اندر لے آیا۔

''شمائلہ آنٹی ' چیک کرلیں ' میں سب سامان لے آیا ہوں۔''

''آئی ایمان۔'' وہ تیزی سے کچن سے برآمد ہوئی تھی ' اس کا حلیہ بے حال ہو رہا تھا ' پسینے میں بھیگی ' کپڑے جسم سے چپکے ہوئے دوپٹا ندارد جھک کر سامان چیک کرنے لگی تو ایمان سٹپٹا کر پیچھے ہوا تھا۔

''میں اب چلتا ہوں۔''

''نہیں ' نہیں ' ایسے کیسے چلتا ہوں ' بیٹھو تو ' میں نے تمہارے لیے فریزر میں کولڈ ڈرنک رکھی ہے ' ایک منٹ میں لے کر آئی۔''

وہ سب چھوڑ چھاڑ کچن کی طرف لپکی تھی۔

ایمان کے خشک ہوتے حلق نے اسے رک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ ٹھنڈی یخ کولڈ ڈرنک نے اس کی پیاس بجھا دی تھی۔ شمائلہ اپنا گلاس لیے اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی۔

''بہت شکریہ ایمان ' تم نہ ہوتے تو میرا کیا بنتا؟''

''ڈونٹ مینشن آنٹی'' وہ مسکرا کر کہتا ' اٹھ کھڑا ہوا۔

''بیٹھو تو سہی ' سارا دن اکیلی بور ہوتی رہتی ہوں ' دو چار منٹس تو اور بیٹھ جاؤ۔'' اس نے بازو سے پکڑ کر اسے دوبارہ بٹھا دیا تھا۔

''مجھے نوٹس بنانے ہیں تو دیر ہو جائے گی۔''

''چلے جانا ' کچھ دیر تو بیٹھو۔''

☼ ☼ ☼

''اتنی دیر کر دی ایمان نے ' ایسا کیا لینے چلا گیا؟''

سمیرا خود میں ہی الجھ رہی تھی ' کچھ دیر اور انتظار کرنے کے بعد وہ اسے فون کرنے کے لیے اٹھنے ہی لگی تھی کہ وہ آگیا۔

''اتنی دیر ایمان ' ایسا کون سا سامان لینے کے لیے چلے گئے تھے؟''

''مما ' ساری گروسری منگوائی ہے آنٹی نے ' اتنی دیر تو لگنی ہی تھی۔''

''اچھا ' آئندہ خیال رکھنا اور تھوڑا تھوڑا کر کے دو تین دن میں لا دیا کرو ' یوں تو بہت دیر ہو جاتی ہے۔''

''میں ایک ہی دفعہ جان چھڑانے کی کوشش کرتا ہوں۔ کون بار بار جائے ' میری روٹین ڈسٹرب ہوتی ہے۔''

''اچھا ' جاؤ اپنا کام کرو۔'' وہ خود بھی کچن میں آگئی تھی۔ ایمان بھی صحیح کہہ رہا تھا۔ روز ' روز کے جانے سے اس کا اپنا بہت سا ٹائم ضائع ہوتا تھا اور وہ اپنی اسٹڈیز میں بہت سینسٹیو تھا ' ہمیشہ پوزیشن لیتا تھا یہ تو وہ سمیرا کی وجہ سے شمائلہ کو منع نہیں کر پاتا تھا ورنہ وہ واقعی ڈسٹرب ہوتا تھا۔

☼ ☼ ☼

''یار ' یہ کیا پکایا ہے؟'' ڈونگے کا ڈھکن اٹھاتے ہی ثوبان کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ مونگ ' مسور کی دال۔

''کیوں سمجھ میں نہیں آیا ' کیا پکایا ہے؟'' سمیرا کی شریر آواز کچن سے آئی تھی۔

''کچھ زیادہ ہی سمجھ میں آگیا ہے ' میرا خیال ہے ڈائٹنگ پر لا رہی ہو ہمیں۔''

''ہاں تو یہ ضروری بھی ' اوور ویٹ ہو رہے ہیں آج کل۔'' وہ ٹرے ہاتھ میں لیے کچن سے برآمد ہوئی تھی ' باپ ' بچوں کے چہرے دیکھ کر اسے ہنسی آرہی تھی۔

''کافی چربی چڑھ گئی ہے۔ اب اسے زائل بھی ہونا چاہیے۔''

''اتنی محنت کرتے ہیں۔ چربی ویسے ہی زائل ہو چکی ہے۔'' ثوبان ٹرے کی طرف متوجہ ہوا ' جہاں سے وہ شامی کباب ' رائتہ اور سلاد ٹیبل پر باری ' باری رکھ

رہی تھی۔

"یہ سب دال کے ساتھ ہی نہیں رکھ سکتی تھیں، خوامخواہ کتنا ہی خون جلا دیا۔" اس نے سمیرا کو گھورا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

"ایکسکیوزمی سر، سوسوری۔ بندی کوتاہی کے لیے معذرت خواہ ہے، کباب فرائی ہونے اور ساتھ سلاد بنانے میں دیر ہو گئی۔"

"تو مما آپ مجھے بلا لیتیں" نمرہ نے جلدی سے کہا۔

"نہیں بیٹا آپ اسٹڈی میں بزی تھیں، خیر ہے اتنا تو ہو ہی جاتا ہے، چلو کھانا شروع کرو۔"

"مما میری دوست ہانیہ نے کہا ہے، وہ سنڈے کو ہمارے گھر آئے گی۔" نمرہ نے بڑی خوشی سے اطلاع دی۔

"ہاں بیٹا ضرور، کس ٹائم آئے گی، میں اچھی سی ریفرشمنٹ تیار کر دوں گی۔"

"شام میں ہی آئے گی۔"

"پاپا آپ سنڈے کو ہمیں کہیں آؤٹنگ پر لے کر چلیں۔" نریمان ٹھنکا۔ ثوبان نے کندھے اچکائے۔

"اب اس کی فرینڈ آ رہی ہے تو میں کیا پروگرام بنا سکتا ہوں۔"

"تو اس کی فرینڈ آ رہی ہے نا، ہم کیوں باؤنڈ ہو کر بیٹھیں۔" وہ چمک کر بولا تو سمیرا نے سرزنش کی۔

"اونہوں! نریمان، تم اپنے پاپا کے ساتھ کوئی پروگرام بنالو، دوسروں کو اپنے پروگرام انجوائے کرنے دو۔"

"اوکے پاپا، میں، آپ اور نمرہ آپی پھپھو کے گھر چلے چلیں گے، مما اور نمرہ بیٹھی رہیں گھر۔"

"اور ایمان؟" ثوبان نے ایمان کو مخاطب کیا جو بہت خاموشی سے بیٹھا تھا۔ اس نے کھانے سے بھی بہت جلد ہاتھ کھینچ لیا تھا۔

"جی پاپا؟"

"آپ کہیں نہیں جاؤ گے؟"

"نہیں پاپا، مجھے اپنا اسائنمنٹ بنانا ہے۔"

"کھانا کیوں چھوڑ دیا، کیا پسند نہیں آیا؟"

"بس مما، بھوک نہیں ہے۔" وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"اسے کیا ہوا ہے، چپ چاپ سا بھی ہے؟" ثوبان نے مستفسرانہ نگاہوں سے سمیرا کو دیکھا۔

"چپ چپ تو پچھلے کچھ دنوں سے ہی ہے، روز سوچتی ہوں، پوچھوں گی۔"

"تو پوچھا کیوں نہیں؟" ثوبان کا لہجہ اس بار کڑا تھا۔

"تو آپ پوچھ لیں، آپ کا کوئی فرض نہیں بنتا؟" اسے بھی غصہ آ گیا۔ ثوبان کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر وہ اٹھ کر ایمان کے پیچھے چلا گیا۔ وہ اپنی اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اس نے فوراً" جرنل بند کر دیا۔

"پاپا، آپ.... آئیے۔" وہ گھبرا سا گیا تھا، ثوبان بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

"آؤ، میرے پاس بیٹھو۔" وہ اسے لیے ہوئے بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔

"کیا بات ہے، آپ پزل ہو رہے ہو؟"

"نہیں پاپا، ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ مزید گھبرا گیا تھا، ثوبان کو سچ مچ گہری تشویش ہوئی تھی، کچھ تو تھا جسے وہ چھپانا بھی چاہ رہا تھا اور چھپا بھی نہیں پا رہا تھا۔

"آپ نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟"

"بس بھوک ہی نہیں تھی؟"

"بھوک کیوں نہیں تھی؟"

اس کی گہری، کھوجتی نظروں سے ایمان مزید گھبراہٹ کا شکار ہو رہا تھا۔ ثوبان نے اسے بازو کے گھیرے میں لے کر اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

"کوئی پرابلم ہے تو مجھے بتاؤ بیٹا، اپنے پاپا کو تو سب کچھ بتا دینا چاہیے نا، کیونکہ وہ آپ سے بہت بڑے ہوتے ہیں اور آپ سے زیادہ جانتے ہیں تو ایسا تو ہو سکتا ہے ناکہ آپ کے لیے ایک چیز بہت بڑا مسئلہ بنی ہوئی ہو اور پاپا کے لیے سرے سے وہ کوئی مسئلہ ہی نہ ہو اور اگر وہ مسئلہ ہو بھی تو ان کے پاس اس کا پراپر سلوشن موجود ہو۔"

"نہیں پاپا، کوئی پرابلم نہیں ہے۔" ساتھ ہی اس

نے کاپی کے اوپر ہاتھ رکھ کر اسے چھپانا چاہا' ثوبان نے ہاتھ بڑھا کر وہ کاپی کھینچ لی تھی۔
"وہ پاپا۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ۔" وہ روکنا چاہتا تھا مگر ثوبان کے سامنے وہی صفحہ کھلا ہوا تھا۔
"مجھے شمائلہ آنٹی بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ میں ان کے گھر نہیں جانا چاہتا' وہ گندی باتیں کرتی ہیں' وہ کہتی ہیں' میں نے مما' پاپا کو کچھ بتایا تو وہ مما کو میرے بارے میں غلط بتا دیں گی' مجھے ڈر لگتا ہے۔" آگے شاید ثوبان کے آنے پر ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ ثوبان سناٹے میں رہ گیا تھا۔ اس کی سوچنے' سمجھنے کی صلاحیت مفلوج ہو گئی تھیں۔
"پاپا! میرا کوئی قصور نہیں' میں نے کچھ نہیں کیا' وہ غلط۔۔۔" ایمان کی حد درجہ گھبرائی آواز نے اس کے سناٹے کو توڑا تھا۔ اس نے بے اختیار اسے ساتھ لگا لیا تھا۔
"آپ اتنا کیوں گھبرا رہے ہو بیٹا' آپ کیا سمجھتے ہو' آپ کے متعلق کوئی کچھ بھی بتائے گا' ہم مان لیں گے' میں یا آپ کی مما' آپ کے متعلق کسی بھی غلط بات کو فوراً" مان لیں گے۔ آپ کو ایسا لگا بھی کیسے' ہم اپنی اولاد کے خلاف کوئی بات سن بھی نہیں سکتے کجا اعتبار کرنا۔ مجھے تو بلکہ اس بات پر آپ سے ناراض ہو جانا چاہیے کہ آپ نے خود یہ بات ہمیں کیوں نہیں بتائی؟"
وہ ہلکے پھلکے انداز میں اسے ریلیکس کرنا چاہ رہا تھا۔ ورنہ اس کے اپنے دماغ میں تو آندھیاں چل رہی تھیں پھر اس نے بہلا پھسلا کر اس سے بہت سی باتیں اگلوائی تھیں' وہ بھی باپ سے شیئر کر کے ہلکا پھلکا ہو گیا تھا' وہ اسے ڈھیروں' دلاسے دے کر' پرسکون ہو جانے کی ہدایت کر کے اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔ اسی پل سمیرا چائے لیے اندر داخل ہوئی تھی۔ ثوبان کو اس وقت چائے کی واقعی بہت طلب محسوس ہو رہی تھی' سو گرم کپ منہ سے لگا لیا تھا۔
"کیا ہوا! ایمان نے کچھ بتایا آپ کو؟"
وہ جواب دیے بغیر چائے پیتا رہا' سمیرا نے حیرت سے اسے دیکھا۔
"کیا ہوا ثوبان' کیا کوئی سیریس بات ہے؟"
"بہت ہی زیادہ سیریس' سن پاؤ گی؟"
"کیا مطلب؟" اسے تو کرنٹ لگا تھا۔
ثوبان نے مختصراً" اسے جو کچھ بتایا تھا' اسے سن کر وہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی تھی۔
"ہر وقت بیٹیوں کی فکر میں ہلکان رہنے کے بجائے تھوڑی سی فکر بیٹے کی بھی کر لی ہوتی تو نوبت یہاں تک نہ آتی' وہ عورت نجانے اسے کیسے کیسے اکساتی اور ورغلاتی رہی ہے' کیسے کیسے ڈراتی بھی رہی ہے۔"
"اس کی اتنی جرات' میں اس کا وہ حشر کروں گی۔۔۔"
"تم کچھ بھی نہیں کرو گی۔" ثوبان نے سختی سے اسے ٹوکا تھا۔
"وہ سارا الزام ایمان پر رکھ دے گی' وہ کوئی کچی عمر کی بچی نہیں ہے کہ تم اس پر چڑھ دوڑو گی اور وہ ڈر کر دبک جائے گی' یہ تحمل سے سوچ سمجھ کر حل کرنے والا مسئلہ ہے تم ایک کام کرو' اس کے شوہر کا نمبر مجھے لا دو۔"
"میں لعنت بھیجتی ہوں اس کی شکل پر' میں اب اسے کبھی دیکھنا نہیں چاہتی" وہ شدید اشتعال کی لپیٹ میں تھی۔
"اسی لیے کہا ہے تحمل سے' آرام سے' اپنا غصہ اتر جانے دو' اور ایمان کا وہاں جانا بالکل بند کر دو بلکہ کچھ دنوں کے لیے میں اسے نعمان کے ہاں بھجوا دیتا ہوں۔ تم مجھے نمبر لا دو۔ اس کے بعد میں تمہیں اگلا پلان بتاؤں گا۔" تیسرے دن وہ بڑی ہمت کر کے اس کی طرف آئی تھی۔ وہ حسب معمول خوش دلی سے ملی تھی۔
"بیٹھیں باجی اور بتائیں کیا لیں گی؟"
"چائے پلوا دو' خود بنانے لگی تھی' پھر سوچا دہیں تمہارے ساتھ ہی پی لوں گی۔"
"ضرور' ابھی لائی۔" وہ مسکراتی ہوئی اٹھی تھی۔
"ایک منٹ' مجھے اپنا فون دو گی' مجھے امی سے بات

کرنی ہے اور میرے فون میں کریڈٹ نہیں ہے۔"
اس نے اپنا فون سامنے کیا' شمائلہ اندر سے اپنا فون لے آئی۔ سمیرا نے اپنے فون سے نمبر دیکھ کر شمائلہ کے فون پر نمبر ملایا اور امی سے بات کی' شمائلہ اس دوران کچن میں جا چکی تھی۔ اس نے جلدی سے کال ختم کی اور فون بک کھولی A کے آپشن میں اسجد کا نمبر ڈھونڈ کر اپنے فون میں محفوظ کیا اور فون سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا۔
چائے پیتے ہی وہ اٹھ گئی تھی۔
"بیٹھیں نا باجی کچھ دیر اور......"
"نہیں اب چلوں گی۔" وہ باہر کی طرف بڑھی۔
"ایمان نہیں آیا' دو دن سے' مجھے اس سے کام تھا۔"
"ہاں وہ ثوبان کے ساتھ نعمان کی طرف گیا تو فاریہ اور نعمان نے اسے کچھ دن کے لیے روک لیا۔"
کتنی مشکل سے وہ مسکرائی تھی' یہ وہی جانتی تھی' شمائلہ کچھ بے چین سی نظر آئی تھی۔
"اوہ' میرے لیے بڑی پرابلم ہو جائے گی۔"
سمیرا نے گہری نگاہ اس پر ڈالی "واقعی" مگر اوپر سے کہا تو یہ کہ
"مجھے لسٹ بنا کر لا دو' جو کچھ بھی منگوانا ہے میں ثوبان کے ساتھ جا کر لا دوں گی۔"
شمائلہ کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوا تھا "چلیں ایسا ہی کروں گی۔"
سمیرا نے بغور اس کے رنگ بدلتے چہرے کو دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼
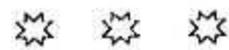
ثوبان نے اسجد سے رابطہ کر کے اسے ہر بات بتائی تھی مگر ساتھ ہی ہر چیز کے مضمرات سے بھی آگاہ کیا تھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق اسجد یہ سب سن کر بھڑک اٹھا تھا۔ ثوبان نے بہت نرمی اور ملائمت سے اسے ٹھنڈا کیا تھا۔ سمجھایا تھا کہ عورت بھی فطری تقاضوں سے مستثنیٰ نہیں ہے' اتنا لمبا عرصہ میاں کی جدائی میں وہ بھی بھٹک سکتی ہے۔ بہرحال ابھی وہ مکمل بھٹکی نہیں تھی' اس کے قدم بہکے ضرور تھے' وہ ان بہکے قدموں کو یہیں روک سکتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ بیوی بچے وہاں بلوا لے یا خود یہاں آ جائے۔ ثوبان نے لگاتار تین دن اس سے رابطہ رکھا اور اسے سمجھاتا رہا' اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اگلے ہفتے پاکستان آ پہنچا' بیوی بچوں کے کاغذات بنوانے اور انہیں ساتھ لے جانے کے لیے۔

☼ ☼ ☼

"اگر اسجد بھائی انہیں یہاں سے نہ لے جاتے تو ہم یہاں کس طرح رہ سکتے تھے' ہمارا ایمان تو ایک جذباتی بھونچال میں پھنس جاتا' وہ عورت تو اسے اپنی عمر سے آگے کے تجربے سکھانے لگی تھی یہ تو پتا نہیں کون سی نیکی کام آ گئی اور میرا بچہ بچ گیا۔" سمیرا نے سکون کا سانس لیا تھا۔ ثوبان نرمی سے مسکرایا۔
"اللہ تعالیٰ کا لاکھ دفعہ شکر ہے کہ ہم بخیر و خوبی اس کرائسس سے گزر گئے۔ ہماری نیت نیک تھی ہم تو اس کے بھلے کے لیے اپنا بیٹا وہاں بھیجتے رہے اور وہ اس کا غلط استعمال کرنے لگی تھی۔"
"ہمارے اسلام کے واضح احکام ہیں' جوان لڑکے لڑکی یا عورت کا تنہائی میں ساتھ بیٹھنا منع ہے' ہم اس کے اصولوں کے خلاف چل کر کیسے اپنے لیے اچھی امیدیں لگاتے ہیں' یہی ایمان دروازہ بجا کر باہر سے بھی سامان دے سکتا تھا نا' یہی صحیح اسلامی طریقہ بھی ہے' لیکن ہم ٹھوکر کھا کر سنبھلنے والے لوگ ہیں اور صد شکر کہ بڑے نقصان سے محفوظ رہے۔"
"یہ تو خیر آپ نے بڑے تحمل سے معاملے کو سلجھایا ہے ورنہ تو پتا نہیں میں تو کیا کر دیتی......"
"ہم جتنا چیختے' چلاتے' دنیا کو سناتے' شمائلہ کی بدنامی تو ہوتی ہی لیکن ہمارا بیٹا بھی بہت بدنام ہوتا۔ ابھی وہ جوانی کی پہلی سیڑھی چڑھا ہے' اسے بلندی پر جانے کے لیے بلند کردار اور ہماری رہنمائی کی بہت ضرورت ہے۔ اس طرح کے کرائسس کا شکار ہونے کے بعد تو اس کی صلاحیتیں تباہ ہو جاتیں' اس کا خود پر

سے اعتماد ہی ختم ہو جاتا' میں نے یہ سب شمائلہ کے لیے نہیں بلکہ ایمان کے لیے کیا ہے' مجھے اپنے بیٹے کو اس بدنامی سے' اس بھٹکے ہوئے رستے پر چلنے سے بچانے کے لیے ہر قدم سوچ کر اٹھانا تھا' شمائلہ نے ٹھیک سوچا تھا کہ کام بھی ہو جائے گا اور یہ کم عمر لڑکا کسی کو بتا بھی نہیں پائے گا' کچھ عرصے میں اگر وہ خدانا خواستہ گمراہ ہو جاتا تو وہ خود کسی کو پتا نہ چلنے دیتا۔"
سمیرا نے جھرجھری لی تھی۔

"توبہ کریں۔"

"صحیح بتا رہا ہوں۔ اس گمراہی میں جو چل پڑا' اسے منزل کہیں نہیں ملتی' وہ بھٹکتا ہی رہتا ہے۔"

"اگر وہ یہاں سے نہ جاتی تو....."

"تو ہم چلے جاتے' میں نے ہر آپشن پہ سوچ بچار کی تھی۔ اب تم بھی سوچ لو کہ بیٹیوں پر بے جا سختی اور بیٹے کو یوں کھلے عام ہر جگہ جانے کی اجازت دے دینا' نارمل رویہ نہیں ہے' اسے بدلو' بیٹوں کے آنے' جانے کو بھی نوٹس کیا کرو مگر سختی سے نہیں پیار سے' محبت سے' بیٹیوں کو بھی اعتماد میں لے کر اچھے' برے حالات کا بتا کر سمجھایا کرو اور انہیں ان کی دوستوں کے ساتھ ملنے ملانے کی اجازت دے دیا کرو' تربیت اچھی کرو گی تو ان شاء اللہ رزلٹ بھی اچھا ہی آئے گا' ایمان کو دیکھ لو اس عورت کے ہر طرح سے اکسانے کے باوجود وہ نہیں بھٹکا' آگے بھی ان شاء اللہ اچھی امید رکھو اور صحیح اسلامی طرز طریق سے ان کی تربیت کرو۔"

"ان شاء اللہ۔" وہ اٹھتے ہوئی بھرپور انداز میں مسکرائی تھی۔

ایک عزم صمیم' ایک نئی امید کے ساتھ کہ حالات خواہ کیسے بھی ہوں' ہم نے اپنے بچوں کو اچھا برا سمجھانا ہے' پھر اللہ کے سپرد کر دینا ہے' وہی انہیں ان بھیڑیوں سے محفوظ و مامون رکھے جو شیطانی جال بچھائے خوش رنگ ترغیبات سے اپنی جانب کھینچتے تو ہیں' پر ہماری دعائیں ہماری نیکیاں' ہمارے بچوں کو بچا لاتی ہیں۔